قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اِکہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اگست 2014ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

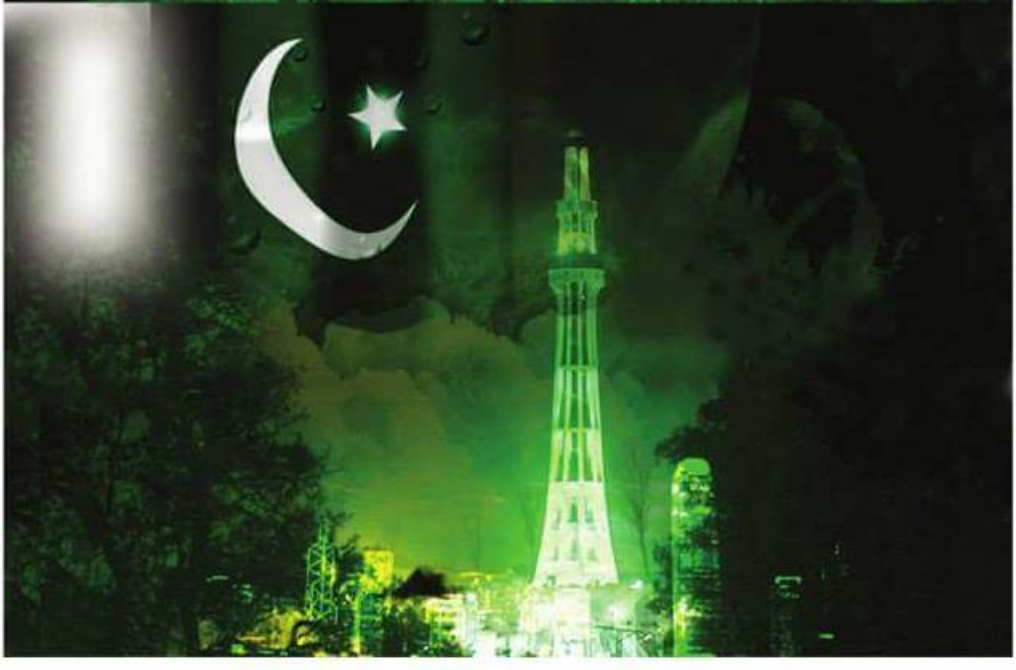

جلد 67 شمارہ نمبر 8 اگست 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: آزادی کے 67 سال	ادارہ	3
قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا اثر	پرویزؒ	6
پرویز صاحب کا نظریہ حدیث وسُنّت	ملک منظور حسین لیل	16
مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اس سے نکلنے کا طریقہ	خواجہ ازہر عباس	28
سانحۂ اِرتحال	ڈاکٹر عبدالرؤف خان	36
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	38
الهداية والعرفان في تفسير القرآن بالقرآن	آصف جلیل	46

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Dahr* – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 29: Chapter 27 Translated by: Dr. Mansoor Alam 51

دفتر کا پتہ 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546

E-mail: idara@toluislam.com

ناشر و چیئرمین
محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی
محمد سلیم اختر

قانونی مشیر
ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون
پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ
سالانہ -/450 روپے
بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر
3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ
برانچ کوڈ (0465)۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

لمعات

آزادی کے 67 سال

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14)

حکیم الامت، علامہ اقبالؒ، تاریخِ انسانی کے بالغ نظرانہ مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ

''عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہوسکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن وسلامتی پر مؤسس ہو..... بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر وعمل میں حسبِ منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پا جائے''۔

نیز

''عالم بشری (کے لئے).....سوائے نظامِ اسلامی کے کوئی اور واحد اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشری کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں انسانی ضمیر کی تخلیق کرے''۔

عالم بشری کے لئے قرآن پر مبنی واحد اجتماعی نظام کو بطور منزل سامنے رکھ کر آپ نے پہلا قدم اٹھایا اور ایک ایسے خطہ کے حصول پر زور دیا جو اس عالمگیر تجربے کے لئے بطور معمل کام دے سکے چنانچہ آپ نے ملت کے سامنے اس مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کیا جس کا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔

انہوں نے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ

''اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے اور اسکی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے''۔

مسلمانانِ برصغیر کی جو تقدیر اقبال کے کارگہِ فکر سے نقش پذیر ہو کر نکلی تھی اس کے عملی حصول کے لئے جس تحریک کی ضرورت تھی اس کی قیادت کے لئے آپ کی نظرِ انتخاب قائداعظمؒ پر پڑی۔ چنانچہ مسلمانوں کی قسمت ان کے ہاتھ سونپنے سے پہلے انہیں آپ نے بتا دیا کہ

''اس وقت حالت یہ ہے کہ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ

گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو..... ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ نشوونما دیا جا سکتا ہے''۔

قائداعظمؒ بھی جنہیں اقبالؒ نے مسلمانوں کی قیادت کے لئے منتخب کیا اور جنہوں نے پاکستان حاصل کر کے دکھا دیا یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات ایسے نظامِ معاشرت میں ہے جو قرآنی اصولوں پر مؤسس ہو۔ ۱۹۴۱ء میں آپ نے حیدرآباد میں فرمایا۔

میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی' یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے' اس سے بہتر تصور ناممکن ہے''۔

یہ تھے وہ محرکات جنہوں نے مسلمانوں کو دنیا بھر کی مخالفت کے علی الرغم اس موقف پر قائم کر دیا کہ مسلمان بہ حیثیت مسلمان ملتِ واحدہ ہے اور اسے اپنی معاشرت کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت ہے جو اجنبی اثرات سے یکسر پاک ہو اور جسے وہ آزادانہ قرآنی تعلیمات کا گہوارہ بنا سکیں۔ کتنی پاک تھیں یہ امنگیں اور کتنی حسین تھیں یہ آرزوئیں۔ شاید انہی کا صدقہ تھا کہ خلافِ توقع اور دیکھتے دیکھتے کرۂ ارض کی سب سے بڑی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آ گئی۔ کتنی بڑی کامیابی تھی یہ! وہ قوم جو کوئی نوے سال پیشتر دولت و حشمت سے اس قدر محروم کر دی گئی تھی کہ اس کی زندگی تک معرضِ خطر میں پڑ گئی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اس امت کی اجل کا وقت آ پہنچا ہے وہی قوم ایک مملکتِ جدید کی مالک بن رہی تھی۔ ایسی مملکت کی مالک جس کی حیثیت تاریخِ اسلام میں ایک دوسرے ''مدینہ'' کی تھی کہ یہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر اور تصورات کی تشکیل بے روک ٹوک اور بلاخوف و خطر کر سکتے تھے۔

قائداعظم جو اس قوم کو ایک فرعون نہیں بلکہ متعدد فرعونوں کے چنگل سے نکال کر اس نئی دنیائے امن و سلامتی میں لے آئے تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ چل بسے تو عجیب افراتفری کا دور شروع ہوا۔ اس گھر کی حالت بعینہٖ وہ ہو گئی جو ایک بزرگ کے اٹھ جانے کے بعد ناخلف اولاد کے ہاتھوں ہو جایا کرتی ہے۔ نام نہاد آزادی کی زندگی کو دیکھا جائے تو پاکستان قرونِ وسطیٰ کا وہ دربار نظر آتا ہے' جس میں بادشاہ کے مرجانے کے بعد سازشوں کا جال بچھ گیا ہو۔ اقتدار کی اس کشمکش سے خانہ جنگی کی وہ صورت پیدا ہوئی کہ مقاصد کی تکمیل تو ایک طرف سرے سے مملکت کی برقراری مخدوش نظر آنے لگی۔

حصولِ پاکستان کے بعد پہلا سوال یہ پیدا ہونا چاہئے تھا کہ جس قرآنی نظمِ معاشرت کے تجربے کے لئے اس خطۂ ارض کو حاصل

کیا گیا ہے اس کا خاکہ کیا ہے اور اس میں کیسے رنگِ عمل بھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک تو اس منفرد ملک کی پیدائش ہی نے اس کے لئے ایسے گوناگوں خطرے پیدا کر دیئے کہ ان سے عہدہ برا ہونا آسان نہ تھا۔ دوسرے قائدینِ پاکستان اہم امور سے ہٹ کر ذاتی اقتدار کے حصول میں منہمک ہو گئے جس سے موانعاتِ راہ ناقابلِ عبور بن گئیں۔ چنانچہ آزادی کے سرسٹھ سالوں میں ہمارے نام نہاد دستور سازوں نے مطلقاً یہ کوشش نہیں کی کہ اسلامی اصولوں کو ترتیب و تشکل کریں تاکہ ان کے مطابق مملکت کا دستور تیار کیا جا سکے۔ ان کا ازخود نہ کرنا شاید اس لحاظ سے قابلِ فہم تھا کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے لیکن جو چیز بالکل ناقابلِ فہم اور ہر طرح ناقابلِ معافی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اقبالؒ کے اس مکتبِ فکر سے ذرا بھی استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی جو قرآنی اصولوں کی تشکیلِ نو میں مصروف تھا اور ہے۔ اس مکتب۔۔ یعنی طلوع اسلام۔۔ نے اسلامی نظام اور قرآنی دستورِ پاکستان کو اس وضاحت سے مرتب کر کے ان کے سامنے پیش کیا کہ اس کی مثال سارے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ اس بے مثل کاوش کے بے نظیر نتائج کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ ستاسٹھ سال میں ہم قدم قدم پر مات کھاتے رہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نتیجہ ہے ہماری غلط روشِ زندگی کا اور یہ بھی کہ ہم جس آئیڈیالوجی کو لے کر چلے تھے اسے ہم نے کہیں بھی نہیں آزمایا۔ لہٰذا جہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اب تک ناکام ہوئے وہاں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ ناکامی ہماری آئیڈیالوجی کی ناکامی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہماری آئیڈیالوجی ناکام نہیں ہوئی بلکہ ابھی اسے آزمایا ہی نہیں گیا تو اس آئیڈیالوجی کو اچھی طرح سمجھئے اور اسے عملاً زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ اور رائج کیجئے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہماری آئیڈیالوجی بالکل محفوظ حالت میں قرآن میں موجود ہے۔ گویا ہم نے کچھ کھویا نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کو ضابطۂ حیات بنائیں۔ اس کے لئے قومی عزم کی ضرورت ہے۔ ہم میں آج تک اس عزم کا فقدان رہا ہے۔ قومیں اس سے محروم ہو کر موت سے ہمکنار ہو جاتی ہیں اور جب اس دولت کو پا لیتی ہیں تو ان کی موت زندگی سے بدل جاتی ہے۔

بہ حیثیت مسلمان، ہماری حیاتِ ملی کے لئے بنیادی اسباب میں سے دو ہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک ہماری بے مثل و بے نظیر آئیڈیالوجی اور دوسرے وہ خطۂ زمین جس میں آئیڈیالوجی کو نافذ کیا جا سکے۔ ہماری آئیڈیالوجی (قرآن) تو شروع سے محفوظ چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ خطۂ زمین جسے ہم نے اس کے لئے حاصل کیا وہ بھی ابھی تک محفوظ ہے۔ اگرچہ متعدد تخریبی قوتوں کا یہ عالم رہا اور اب تک ہے کہ (غالب سے معذرت کے ساتھ)

آوارۂ غربت ننواں دید صنم را
''خواہم'' کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

یہ خطۂ زمین ہمارے پاس محفوظ ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ آج ۱۴/ اگست ۲۰۱۴ء نہیں بلکہ ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء ہے۔ لہٰذا اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر آپ صحیح خطوط پر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نئے سرے سے آغاز کر دیجئے۔

☆.....☆.....☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویزؒ

آخری قسط

قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا اثر

SEX AND CULTURE

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ:

آج تک کوئی قوم شق نمبر ا کے ''مطلق وحدتِ زوج'' کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔ (ص ۳۴۴)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِعمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر ''کامل آزادی'' کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (ص ۳۴۵)

بہترین تمدن کی حامل قوم:۔ اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے۔ ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق نمبر ۲ کی ترمیم شدہ وحدت زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا عام اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابل تنسیخ نہ ہو بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہوسکتا ہو یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عائد کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے مختلف ماہرین علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں وہ کہتا ہے کہ

جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (Tension) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (Compression) پیدا ہو جاتا ہے۔ (ص ۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت (Sublimation) کہا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ

نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود و پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوت فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (ص ۳۱۷)

فرائڈ کی تحقیق:۔ بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آ جائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان کی بے باکانہ تسکین ہی مقصد زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں (جسے Sublimation کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی، جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں (۲)۔

قرآنی کظامت:۔ فرائڈ نے اس طریق عمل کا نام Sublimation رکھا ہے۔ یہ علم تجزیۂ نفس (Psycho-Analysis) کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں (جسے عام طور پر ازمنہ مظلمہ (Dark-Ages) کہا جاتا ہے) کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورہ آل عمران میں مومنین کی ایک صفت الکاظمین الغیظ بتائی گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنویں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں (Subterranean Channels) کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنویں میں پانی زیادہ ہوتا۔ اس کا فالتو پانی دوسرے کنویں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔ اس طریق عمل کو ان کے ہاں کظامت کہا جاتا تھا۔ لہٰذا کاظمین الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے۔ کسی دوسری طرف منتقل کر کے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصر حاضر کے ماہرین تجزیہ نفس نے (Sublimation) سے تعبیر کیا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوت فکر و عمل اور محاسبہ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس

جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں۔ ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (ص ۳۹۸)

اضمحلال:۔ قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ **ولا یزنون** وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔

اس لئے کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (25:68) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اثم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں اثمتہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے۔ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ جس تک دور حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ معاشرتی توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انون نے یہ بھی کہا ہے کہ

> مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت، شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے۔ (ص ۳۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ وَالْحٰفِظٰتِ (33:35) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو قطعاً داغدار نہ ہونے دیں اور جرم زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے (24:2)۔

قرآنی حد بندی:۔ قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے۔ یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے یا مرد کا کسی دوسری عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضی مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ "ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی" نہیں ہوتی بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عائد کئے ہیں مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہئے تھا (اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (Sexual Opportunities) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح، جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (Life-long Companionship) کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا ہے کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔

وحدت ازدواج:۔ علاوہ بریں اس نے وحدت زوج (Monogamy) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعدد ازواج کو

محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اس کی بھی محض اجازت ہے، حکم نہیں) آپ دیکھیں گے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدت زوج (Absolute Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ میں نے ''قریب قریب'' اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک ''مطلق وحدت زوج'' میں شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے لیکن قرآن نے نباہ نہ ہو سکنے کو بھی فسخِ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہر حال، یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا اور نکاح کے بعد عام حالات میں صرف ایک جوڑے کو باہم گروابستہ رکھتا ہے۔ تنوع (Change) کی خاطر تنوع (Change) کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی مُحْصِنِيْنَ کے ساتھ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (4:24) کا اضافہ کیا ہے حصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی متصور ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم حد تک لے جائے اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف (Recognised) طریق سے مہیا کئے جائیں اور ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ:

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت ''مطلق وحدتِ زوج'' کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقد نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں۔ (اس لئے کہ اس وقت تک ''زندگی بھر کی جبری رفاقت'' تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا۔ وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (ص ۸۴)

☆.....☆.....☆

عربوں کی تاریخ:۔ ڈاکٹر انون نے اپنی تحقیق کے دوران ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب، قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کر دی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رک گئیں۔ (ص ۴۲۹) اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک

اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں (ص ۴۲۹) کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ پر غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت و ضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے ''محصن'' (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت۔ نکاح میں وحدت زوج (Monogamy) بطور اساسی اصول اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز) لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی ضرورت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے' بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں۔ طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلی ازواج (۳) اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں) تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو علیٰ حالہ قائم رکھنے کی صلاحیتیں باقی۔

جنسیات میں الجھی ہوئی قوم کی حالت:۔ اس قسم کی قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ:

> اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی (۴)۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (Causes) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)..... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جوان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں..... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز' گنڈہ تعویذ' اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اس قسم کے معتقدات' اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی

خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بالکل حیوان ہوتے ہیں (۵)۔ (ص ۳۴۶-۳۴۵)۔

آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آ رہی اور کیا آج بھی ساری دنیا میں ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔ ان کے ممالک میں لونڈیاں آج تک سر بازار بکتی ہیں۔

ہمارا نوجوان طبقہ:۔ یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا' انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اس لئے ''ازمنہ مظلمہ'' کے ان اغلال وسلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں:

> ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ لڑکے پر..... بچپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہو..... مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش ہوئی۔ اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (ص ۳۴۸)۔

اس کا نتیجہ:۔ یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان میں سن لیجئے وہ کہتا ہے کہ:

> لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں لیکن انسانی ہیئت تو کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں جو ریفارمران میں مفاہمت (Compromise) کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے کوئی انسانی معاشرہ ہو اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی۔ (ص ۴۱۲)

بنابریں:۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھائے جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی (ص ۴۱۴)۔

☆.....☆.....☆

پس چہ باید کرد:۔ آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جایا جائے اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہو گئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک' کم از کم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔ (ص ۴۳۲-۴۳۱)

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت:۔ آپ نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو! آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آ رہے ہیں یہ کہنا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کیا تھا' شائد اپنی ہنسی اڑانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے یہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** (2:228) قاعدے اور قانون کی رو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ لہٰذا قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے تو کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کر لیں۔

☆.....☆.....☆

آخر میں ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ:

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک' بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک' بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی

جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا (ص ۴۳۲)۔

قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں۔ وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں مسلسل خطبات کے ذریعے ان تمام احکام کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے لاتا جس سے آپ کو اندازہ ہوتا کہ قرآن کس قسم کے معاشرہ کا نقشہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک جنسی تعلقات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ (اس کے متعلق اگر آپ تفصیل سے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'' کا مجموعہ دیکھئے جس میں ان تمام امور کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے)۔

ایک بنیادی حقیقت:۔ لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک' پیاس' نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے اور جس طرح بھوک' پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا (Relax) کر دیا جاتا ہے اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہئے۔ یہ تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (Natural Instinct) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے شروع میں آپ کو اس کا خیال نہیں آتا وہ بڑھتی ہے تو آپ کو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی پی لیتے ہیں تو فبہا' ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھی ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ

۱۔ بھوک' پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں آپ کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

۲۔ اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل:۔ لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ آپ اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر آپ کے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر آپ کا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی ''اضطراری حالت'' کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبط نفس سے کام لے۔ (24:33)

ضبط نفس:۔ اور یہ ضبط نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ نہ خیالات کو طیورِ آوارہ بنائیے۔ نہ توجہ اس طرف جائے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ

میں حالت یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

(ترجمہ: شکار خود شکاری سے کہے کہ مجھے پکڑ لو)۔

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکابِ جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ **لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ** (6:152) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو ان اسباب و ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آ جاتے ہیں اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں یعنی دل میں گزرنے والے خیالات آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں اسی لئے اس نے کہا ہے کہ **يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ** (40:19) وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری (راز) تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیر قلب و نگاہ کہتے ہیں یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ اس کے لئے ابھی وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ قرآن کس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جاتا لیکن اس میں جنسی محرکات کبھی بے باک نہیں ہونے پاتے اور انسانی خیالات میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی۔

☆.....☆.....☆

بہر حال آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط، محض ایک طبعی فعل (Biological Action) نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب و تمدن اور کلچر اور ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقافت میں ممتاز حیثیت حاصل کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھیں۔ یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں اور ان ''شرعی اجازتوں'' کو بھی حدود اللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی) مذہب کی بناء پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروج چلی آ رہی ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ سنت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

(طلوع اسلام فروری 1957ء)

☆.....☆.....☆

حواشی

۱ واضح رہے کہ ان کا انداز اس طریق سے مختلف ہے جو آج کل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رو سے ایک خاص خطہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دیدیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار (Statistics) مہیا کر کے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرت انسانی کے ترجمان ہیں۔ آج کل امریکہ میں (Kinsley) کے قسم کے ''محقق'' اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریق کار کبھی عالمگیر (Universal) نتائج بہم نہیں پہنچا سکتا۔

۲ اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہوئے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں ہم اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳ رابرٹ برفا (Briffault) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (The Mothers) اس میں وہ ایک گروہ کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا یہ جنسی اختلاط کے متنوع مواقع کی ایک مثال ہے۔ اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔

۴ دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ **لھم قلوب لا یفقھم بھا** ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

۵ یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ **یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ** (47:12) وہ سامان زیست سے اسی طرح فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

☆.....☆.....☆

تصحیح

جولائی 2014ء کے طلوع اسلام کے صفحہ نمبر 3 کے آخر میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 6 کی جگہ غلطی سے آیت نمبر 4 لکھی گئی ہے۔ براہِ کرم اپنے نسخوں میں تصحیح فرمالیں۔ ادارہ

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط سوم

پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت

حدیث صرف وہی صحیح ہے جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہو کیونکہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ حضور کریم ﷺ کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ حدیث وسُنّت' وحی یا وحی کی کوئی قسم نہیں' کیونکہ وحی کے صحیح اور غلط ہونے کو تو زیر بحث لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ احادیث وسُنّت کی صحت ہمیشہ زیر بحث رہی ہے۔

سُنّت کی بحث:۔ اسلام میں قانون سازی کے سلسلہ میں ''کتاب وسُنّت'' کی اصطلاح کثرت سے استعمال کی جاتی ہے لہٰذا، اس اصطلاح کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسے ''نظریہء اجتہاد'' کے تحت زیرِ بحث لانا مناسب ہے مگر چونکہ ''سنت'' کا تعلق ''حدیث'' سے ہے لہٰذا، روایات واحادیث کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ''سنّت'' کی اصطلاح پر بحث یہاں بھی بے جا نہیں ہو گی کیونکہ بعض کے نزدیک ''سُنّت'' کا مطلب ''حدیث'' ہی ہے جبکہ بعض اسے تھوڑا سا مختلف سمجھتے ہیں۔ بہر حال! مفہوم جو بھی لیا جاتا ہو، ''سنّت'' کے لفظ کو قرآن کے ساتھ ہی استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ ''قرآن'' کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں ''کتاب و سنت'' کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی بلکہ ہر جگہ ''کتاب وحکمت'' کے الفاظ آئے ہیں۔ تمام انبیاء کو ''کتاب وحکمت'' عطا کی گئی۔ اگر کسی مملکت میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی بحث چھڑ جائے تو کہا یہ جاتا ہے کہ:۔ ''مملکت میں قرآن وسنّت کو نافذ کیا جائے۔'' مملکتِ پاکستان کے آئین میں بھی قرار دیا گیا ہے کہ ''کوئی قانون قرآن وسنّت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا'' لیکن بدقسمتی سے اسلام کے نفاذ کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا (اور اگر ''سنت'' کی تعریف اور فرقہ بندی کی صورتِ حال یہی رہی تو یہ مسئلہ آئندہ بھی حل نہیں ہو سکے گا۔ موءلف)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنّت کی تعریف تمام فرقوں کے نزدیک مختلف ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ہے کہ۔ ''جب علمائے کرام نے مطالبہ کیا کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق درج کی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ''کتاب وسنّت'' کے خلاف ہو تو ہم نے کہا کہ اس شرط کے مطابق کوئی ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے

مسلمانوں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔اس لئے کہ ''کتاب'' (قرآن مجید) تو ہر فرقہ کے نزدیک متفق علیہ ہے (یہاں ہم نے شیعہ حضرات کے مسلک سے بحث نہیں کی) لیکن ''سنت'' ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔اس پر شور مچادیا گیا کہ طلوع اسلام منکرِ سنت ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے، کافر ہے، مرتد ہے، وغیرہ وغیرہ۔کامل بیس برس تک یہ حضرات طلوع اسلام کو کافر و مرتد کہتے رہے لیکن کتاب وسنت کی رو سے نہ کوئی متفق علیہ ضابطہء قوانین مرتب ہوسکتا تھا، نہ مرتب ہوا۔بالآخر مودودی صاحب کو اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ:۔''کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔'' (بحوالہ: ایشیاء۔مورخہ:۲۳۔اگست ۱۹۷۰ء)۔اس سے واضح ہے کہ جب تک اسلام مختلف فرقوں میں بٹا رہے گا، ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید (یا معیار) کے مطابق سنت کا اتباع کرتا رہے گا۔لیکن جونہی آپ اُسے وحدتِ اُمت کی اجتماعی شکل دینے کی کوشش کریں گے، (موجودہ تصور کے مطابق) اتباعِ سنت ناممکن ہوجائے گا''۔''واضح رہے کہ ''کتاب وسنت'' میں کتاب (قرآن) کا لفظ محض برائے وزنِ بیت شامل کیا جاتا ہے۔اصل سند ''سنت'' کو قرار دیا جاتا ہے۔اور ''سنت'' مشتمل ہے ان تاریخی اور روایاتی حوالوں پر جن کا تذکرہ ''طلوعِ اسلام میں کثرت سے کیا جاتا ہے۔(مثال کے طور پر) رجم کی سزا بہ نصِ صریح قرآن کے خلاف ہے۔اسے مطابقِ اسلام قرار دینے والے، تاریخی سندات سے ایسا کرتے ہیں۔قرآن کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔''

فرقہ بندی کی آئینی اجازت:۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں آئینِ پاکستان کے آرٹیکل نمبر ۲۲۷ میں یہ ترمیم کردی گئی کہ'' پرسنل لاء کے اطلاق کے معاملے میں، قرآن وسنت کا وہ مفہوم قبول کیا جائے گا جو مفہوم متعلقہ فرقے کے نزدیک صحیح ہوگا۔'' اس طرح ''اسلامی پبلک لاء'' کے معاملے میں تو کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہوسکا، البتہ قرآن کریم کے منشاء کے یکسر خلاف، فرقوں کے وجود کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا بلکہ فرقہ بندی (سیکولرازم) کی اجازت دے دی گئی۔ایسا کچھ صرف سیاسی ضروریات اور مفادات کے تحت کیا گیا ورنہ قرآن کریم تو فرقہ بندی کو شرک سے بھی بڑا ظلم قرار دیتا ہے (۲۰/۹۴)۔اور حضور کریم ﷺ سے کہتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۵۹)۔

مودودی مرحوم اور سُنّت:۔ طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۷ء ص۔۲۷۔۲۶۔''سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے، وہ سب سنت ہے۔لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔دراصل سنت، اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی ﷺ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔یہ دونوں چیزیں، کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں۔اور ایسی صورت میں یہ فرق وامتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز وسنت ہے اور کونسا جز وعادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔'' (رسائل ومسائل۔حصہ اوّل۔ص۔۳۱۱۔۳۱۰)۔واضح رہے کہ احادیث کی کسی کتاب میں بھی یہ مذکور نہیں کہ حضور ﷺ نے فلاں کام رسول ہونے کی حیثیت سے کیا تھا اور فلاں کام انسان ہونے کی حیثیت سے۔مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ سنت انہی

کاموں کو کہا جائے گا جو حضور ﷺ نے بحیثیت رسول کئے تھے۔ اور اس کا فیصلہ بھی وہی شخص کر سکتا ہے جو دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی مزاج شناسِ رسول کی نگہ بصیرت، اور صحیح احادیث میں سے سنت کا تعین بھی اسی کے فیصلے پر منحصر۔ رسول اللہ ﷺ کے طریق عمل کے اس امتیاز کے متعلق وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ ''تمدن اور معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی ﷺ تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز، وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے ان اصولوں کی پیروی کرنے کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور ﷺ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر، جس میں آپ پیدا ہوئے تھے۔ اور کچھ اُس زمانہ کے حالات پر، جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنانا مقصود نہ تھا۔'' (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۳۱۷)۔ اسی کی وضاحت میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ ''بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت، اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں، ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی ﷺ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن، یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں، ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا من جملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔'' (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۳۱۴)۔ پھر لکھتے ہیں۔ ''جو امور آپ ﷺ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔'' (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۳۰۰)۔ تحریف اور خطرناک تحریف۔ کہتے ہیں۔ ''میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے۔ جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔'' (ایضاً۔ ص۔ ۳۰۸)۔ مولانا مودودی مرحوم کی کتب تفہیمات اور رسائل و مسائل کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ احادیث اور سنت کے لئے صحیح اور غلط کا معیار نہ تو علمِ اسماء الرجال، نہ ہی فقہاء اور نہ ہی قرآن کریم کو قرار دیتے ہیں۔ وہ ''مزاج شناسِ رسول'' کی نگہ بصیرت کو احادیث و سنت کی صحت کا معیار قرار دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ دین اور دنیا یعنی دین اور سیاست کو الگ الگ نہیں مانتے۔ لیکن تفہیمات حصہ اول صفحہ نمبر ۲۷۹ کے مطابق دین اور دنیاوی امور کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق ''سنت بھی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور واجب الاتباع نہیں ہوگی۔ نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ کے احکام تو غیر متبدل رہیں گے لیکن انسانوں کے تمدنی، سیاسی، معاشرتی، معاشی امور سے متعلق احکام غیر متبدل نہیں ہوں گے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے تغیر و تبدل کیا جا سکے گا۔ کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں۔'' (طلوع اسلام جنوری ۱۹۷۷ء۔ ص۔ ۳۱۔ ۳۰)۔ حالانکہ وہ اپنی کتاب ''تفہیمات۔ حصہ اول۔ ص۔ ۲۴۱ پر لکھتے ہیں کہ:۔ ''جس وقت اللہ تعالیٰ نے

آپ ﷺ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ﷺ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ ﷺ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ ﷺ مبلغ، اور معلم بھی تھے۔ مربی اور مزکی بھی تھے۔ قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔'' ''جبکہ رسائل و مسائل میں وہ حضور ﷺ کی شخصی زندگی اور رسالت کو الگ الگ قرار دے رہے ہیں۔'' (طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۸ء۔ ص۔۴۲)۔

کتاب و سُنّت:۔ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۳ء۔ ص۔۵۷:۔ ''تحریکِ پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہوگی، تو ذہنوں میں یہی تھا کہ اسلام ایک ایسی وحدت (Unity) ہے جس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس وحدت پر مملکت کی بنیاد نہایت آسانی سے استوار ہو جائے گی۔ لیکن یہاں آ کر جب اسلام کی عملی تعبیر کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ہمارا مروّجہ اسلام، ایک وحدت نہیں، مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ کا اسلام الگ الگ ہے۔ اس سے بڑی تشویش لاحق ہوئی کہ یہ مملکت قائم کس طرح ہو سکے گی؟۔ مذہبی پیشوائیت اتنی عظیم مملکت پر نگاہ لگائے بیٹھی تھی۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ مملکت ان کے ہاتھوں سے چھن جائے گی۔ وہ فوراً آگے بڑھے اور کہا کہ ہمارے فرقہ وارانہ اختلافات کو اچھالنا بڑا گمراہ کن پراپیگنڈہ ہے۔ ہمارے یہ اختلافات فرعی ہیں۔ ان کے باوجود ہم میں ایک قدرِ مشترک ایسی ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ ہے

''کتاب و سنت''۔ مملکت کی بنیاد اس پر استوار ہوگی۔ لیکن جب اس دعویٰ کا تجزیہ کیا گیا تو نظر آیا کہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جو قوم کو دیا جا رہا ہے۔ یہ ''کتاب و سنت'' ہی کا اختلاف ہے جس پر ہمارے الگ الگ فرقے قائم ہیں۔ اس اصطلاح میں ''کتاب'' کا نام تو محض تبرکاً لیا جاتا ہے۔ اصل اہمیت ''سنت'' کو حاصل ہے۔ آیئے ہم مختصر الفاظ میں دیکھیں کہ ''سنت'' کے متعلق ان کے اختلافات کس قدر شدید ہیں:۔

اختلافات:۔(۱)۔ اہلِ حدیث حضرات کا عقیدہ ہے کہ حدیث اور سنت میں کوئی فرق نہیں۔ صحیح احادیث کے مجموعہ کا نام ہی سنت ہے۔ لیکن مودودی (مرحوم) کو اس سے اختلاف تھا۔ (مولانا مودودی مرحوم کا نظریہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ فرمالیں۔ مئولف)۔۔۔ سنت کے متعلق مودودی (مرحوم) کے اس عقیدہ کے خلاف، جماعت اہل حدیث نے سخت احتجاج کیا اور جمعیت اہل حدیث کے صدر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے اپنے کتابچہ۔۔۔ جماعت اسلامی کا نظریہء حدیث۔۔۔ میں لکھا:۔ ''میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔۔۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔'' (ص۔۱۱۰:۶۳)۔ یہ ہے سنت کے متعلق ان دو اہم گروہوں کے اختلاف کی شدت کا عالم!۔۔۔ پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک گروہ کے نزدیک حدیث اور سنت ایک ہی چیز ہے اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ۔۔۔ سنت کو احادیث سے مستنبط کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے ان دونوں میں حدیث، قدرِ مشترک قرار پا جاتی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ احادیث کے متعلق ان کے اختلافات کا کیا عالم ہے۔

جماعت اہل حدیث کا عقیدہ ہے کہ:۔ ''تحقیق وتثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا۔۔۔ جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہء سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔'' (جماعت اسلامی کا نظریہء حدیث۔ص۔۴۸)۔۔اس معیار کے مطابق، ان حضرات کے نزدیک:۔ بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے۔۔۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً۔ص۔۵۵)۔ یعنی جماعت اہل حدیث کے عقیدہ کی رو سے، بخاری اور مسلم کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے جس سے وہ شخص اُمتِ محمدیہ ﷺ کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔۔۔ اور مولانا مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ:۔ ''یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں، ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔'' (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)۔ یہ اس لئے کہ:۔ ''قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں۔۔۔ ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو اسناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی (ﷺ) کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ واقعی حضور ﷺ کا ہے یا نہیں۔'' (رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ ص۔۲۷۰)۔۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ سنت کے متعلق ان دونوں گروہوں میں کس قدر بنیادی اختلاف ہے۔ ایسا اختلاف جس کی بناء پر اہل حدیث حضرات کے نزدیک مودودی (مرحوم) اور ان کے ہم عقیدہ دیگر حضرات کافر، اور ملتِ اسلامیہ سے خارج قرار پاتے ہیں۔ اور مودودی (مرحوم) کے نزدیک، اہل حدیث حضرات دین میں تحریف کرنے کے جرمِ عظیم کے مرتکب!۔۔۔ یہ اختلاف مودودی (مرحوم) اور جماعت اہل حدیث ہی میں نہیں۔ اہل حدیث اور حنفی حضرات میں بھی ہے۔ (جن کے سرخیل مفتی محمود مرحوم تھے)۔ حنفی علماء میں مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم) کا مقام بڑا بلند تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اہل حدیث کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کا انکار بھی کفر ہے۔

مولانا عثمانی (مرحوم):۔ لیکن مولانا عثمانی مرحوم کا ارشاد ہے:۔ ''حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری و مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں۔ اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے۔ مگر اس سے وہ مواضع مستثنیٰ ہیں جن پر دار قطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محل اختلاف ہیں۔ دار قطنی وغیرہ نے تقریباً دو سو احادیث پر تنقید کی ہے۔ جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔'' (بحوالہ طلوع اسلام اگست ۱۹۵۹ء۔ص۔۷۴)۔۔۔ یعنی اہل حدیث کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے۔ اور حنفی حضرات ان میں سے کم از کم دو سو احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ اس بناء پر اہل حدیث حضرات حنفیوں پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ ان فرقوں میں بُعد اور منافرت کس قدر ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ مولانا مفتی محمد حسن (مرحوم) مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (مرحوم) کے خلیفہ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے بانی تھے۔ ان کے متعلق مولانا جمیل احمد صاحب نے حسب ذیل واقعہ، اخبار خدام الدین (لاہور) کی ۱۴۔ جون ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں بیان کیا

تھا:۔''(مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی (نوراللہ) سے بیعت کی درخواست کی۔حضرت نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ تم نے احادیث مبارکہ، اہل حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں اور میں حنفی ہوں۔جوڑ پیدا نہیں ہوگا۔لہٰذا، آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں، پھر درخواست بیعت کریں۔اس پر حضرت مفتی صاحب نے تین سال دیوبند میں تعلیم میں صرف کئے۔اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا''۔۔یہ ہے اہل حدیث اور حنفی حضرات کے اختلافات کا عالم۔لیکن اس سے آپ یہ خیال نہ فرمالیں کہ حنفی حضرات مودودی (مرحوم) کے ساتھ متفق ہیں۔مودودی (مرحوم) کے متعلق، مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم) کا ارشاد تھا:۔''یہ شخص، منکرِ حدیث ہے۔گمراہ اور مبتدع ہے، جاہل اجہل ہے۔پاگل ہے۔''(مقامِ حدیث۔جلد دوم۔ایڈیشن اوّل۔ص۔۴۱۱۔۴۱۰)۔۔۔یہ تصریحات سنیوں کے متعلق ہیں۔شیعہ حضرات، سنیوں کے کسی بھی مجموعہ احادیث کو صحیح نہیں مانتے۔ان کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔۔۔ان مختصر سی تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ سنت کے معاملہ میں ہمارے مختلف فرقوں میں کس قدر شدید اختلافات ہیں۔سنت کا یہی اختلاف ہے، جس کی بناء پر:۔(۱)۔مختلف فرقوں کی نمازیں الگ الگ ہیں۔اور ہر فرقہ اپنی نماز کو سنت پر مبنی قرار دیتا ہے۔نمازوں کے اوقات تک الگ ہیں۔روزانہ نمازوں کے علاوہ، جمعہ کے الگ الگ وقت۔عید کی نمازوں کی جماعتیں الگ الگ اور ان کے اوقات الگ الگ۔جنازہ کی نمازیں بھی الگ الگ۔ان سب کا مدار سنت پر بتایا جاتا ہے۔(۲)۔ان کی اذانیں بھی الگ الگ ہیں۔اور ہر ایک اپنی اذان کی سند سنت سے لاتا ہے۔وضو تک کی جزئیات الگ الگ ہیں۔(۳)۔رمضان میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ حنفی بیس تراویح پڑھتے ہیں۔اہل حدیث صرف آٹھ۔عیدین کی نماز میں حنفی چھ تکبیریں زائد کہتے ہیں، اہل حدیث بارہ تکبیریں۔(۴)۔روزوں کے مسائل الگ الگ۔زکواۃ کی جزئیات الگ الگ۔(۵)۔نکاح و طلاق کے احکام الگ الگ۔وراثت کے احکام الگ الگ۔غرضیکہ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں احکامِ سنت میں اختلاف نہ ہو۔ان اختلافات سے یہ حضرات یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ ان کا تعلق عقائد، عبادات اور پرسنل لاز سے ہے۔امورِ مملکت سے ان کا تعلق نہیں۔اس لئے اسلامی مملکت میں، ہر فرقہ کو ان امور کی آزادی حاصل ہوگی۔مملکت ان میں دخل انداز نہیں ہوگی۔مملکت کا دائرہ صرف پبلک لاز تک محدود ہوگا۔اور یہ لاز کتاب وسنت کی رو سے مرتب ہوں گے۔جن کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں ہوگا۔بیس سال تک ان حضرات نے قوم کو مغالطہ میں مبتلا رکھا کہ پبلک لاز کے معاملہ میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا۔اس طرح ہم مملکت میں اسلامی نظام قائم کردیں گے۔اس دعویٰ کے سب سے بڑے داعی مودودی (مرحوم) تھے۔ہم اُن سے بار بار کہتے رہے کہ یہ معاملہ بڑا نازک اور اہم ہے۔اس پر مملکتِ پاکستان کے مستقبل کا انحصار ہے۔خدا کے لئے وضاحت سے بتائیے کہ ایسا کس طرح ممکن ہوگا؟۔بیس سال تک وہ اس سوال کے جواب سے گریز کرتے رہے۔لیکن بالآخر انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ:۔''کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔''(اخبار ایشیاء ۲۳۔اگست ۱۹۷۰ء)۔۔اس طرح کتاب وسنت کی بنیادوں پر، اسلامی قوانین مرتب کرنے کے دعویٰ کی قلعی کھل گئی۔

اکثریت کا غیر قرآنی اصول:۔ پوچھا گیا کہ پھر پبلک لاز کیسے مرتب ہوں گے۔(مودودی مرحوم نے) کہا کہ ملک میں

اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے یہاں فقہ حنفی رائج کردی جائے گی۔ اس پر اہل حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔ انہوں نے کہا کہ جس فقہ کو ہم اسلامی نہیں مانتے، اگر اسے مملکت کے قوانین کی حیثیت سے ہم پر ٹھونسا گیا تو ہم انہیں کس طرح اسلامی تسلیم کر کے ان کی اطاعت کریں گے؟۔ جب مفتی محمود (مرحوم) نے سرحد میں وزارت قائم کی تھی تو بریلوی حضرات نے احتجاج کیا تھا کہ:۔ ''مفتی صاحب دیوبندیت کو مسلط کرنے کے لئے اپنے اقتدار کو استعمال کر رہے ہیں۔'' (تنظیم اہل حدیث۔ ۱۶/۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)۔۔۔ اس کے بعد ان حضرات نے ''کتاب وسنت'' کے نعرہ کو چھوڑ کر ''نظامِ مصطفےٰ'' کا نعرہ اختیار کیا۔ لیکن ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ کیا ''نظامِ مصطفےٰ'' کتاب وسنت سے الگ ہوگا؟۔ اگر یہ کتاب وسنت ہی پر مبنی ہوگا، تو اس میں ایسا ضابطہ، قوانین کس طرح مرتب ہو سکے گا جو اہل حدیث، شیعہ اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا جائے۔ نہ کسی نے ان سے پوچھا۔ نہ انہوں نے از خود اس کی وضاحت ضروری سمجھی۔۔۔ مذہبی پیشوائیت کا تو فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ ہر بات مبہم رہے۔ ہم عوام سے تو کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ ایسے اہم معاملات کے عواقب کا سمجھ لینا ان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ملک کے تعلیم یافتہ دانشور طبقہ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے معمولی سمجھ کر آپ اس سے اس طرح لاتعلق ہو کر بیٹھے رہیں۔ اس مسئلہ کا بنیادی تعلق اس مملکت کی سالمیت بلکہ بقاء سے ہے۔ ہم نے، آپ نے اور ہماری آنے والی نسلوں نے اس ملک میں رہنا ہے۔ ہماری عزت، آبرو، عصمت و عفت، جان اور مال کی حفاظت، سب اس کی حفاظت سے وابستہ ہے۔ اگر آپ اس وقت اس مسئلہ سے لاتعلق ہو کر بیٹھے رہے تو یاد رکھئے! یہاں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ اگر یہ مسئلہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہا تو ایک ایک ایشوع پر ان میں سر پھٹول ہوگی۔ اسی طرح جس طرح آج مسجدوں کی تولیت پر ان میں سر پھٹول ہوتی ہے۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں ملک کا کیا حشر ہوگا؟''۔۔۔ آخر میں تحریر ہے کہ:۔ ''اسلام'' میں اس قدر فرقے ہوں اور ہر فرقہ کا ''اسلام'' الگ الگ ہو، وہ اسلام، ایک مملکت کا دستورِ اساسی بن کیسے سکتا ہے؟۔ بہرحال!۔ اس ''اسلام'' کی رو سے مملکتِ پاکستان کا جو حشر ہوگا، اسے ہم نے کھلے کھلے الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب یہ قوم کے باہوش طبقہ کا کام ہے کہ وہ سوچے کہ اس ملک کو تباہی سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم ان سے عرض کریں گے کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ حقیقی اسلام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ مملکت کی اساس و بنیاد بن سکے۔ اور ایسا نظام قائم کر سکے جو نہ صرف مستحکم اور پائیدار ہو بلکہ مثالی بھی ہو۔ اور وہ حقیقی اسلام قرآن مجید میں محفوظ ہے جو نبی اکرم ﷺ اُمت کو دے کر گئے تھے۔''

مجموعہء کتاب وسُنّت:۔ طلوعِ اسلام جون ۱۹۸۱ء۔ ص۔ ۳۷:۔ ''کتاب تو ایک متعین کتاب ہے۔ یعنی قرآن مجید۔ لیکن سنت کی اصطلاح جس قدر مقدس ہے اتنا ہی اس کا مفہوم غیر متعین ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ہر حدیث سنت ہے لیکن دوسروں کے نزدیک سنت سے مراد حضور ﷺ کے صرف وہ اعمال ہیں جو آپ ﷺ نے بہ حیثیت رسول التزاماً سرانجام دیئے تھے (سنت کی یہ تعریف مودودی مرحوم کی ہے)۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتیٰ کہ بخاری اور مسلم کا مجموعہ بھی نہیں۔ سنت کے متعلق دشواری اس سے بھی زیادہ ہے۔ حدیث کا کوئی مجموعہ ایسا

نہیں جس میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہو کہ حضور ﷺ نے فلاں کام بہ حیثیت رسول التزاماً کیا تھا اور فلاں کام شہری کی حیثیت سے۔ لہٰذا، سنت کا بھی کوئی متفق علیہ مجموعہ امت کے پاس نہیں۔ مودودی مرحوم نے کہا تھا کہ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگہء بصیرت ہی کر سکتی ہے اور جماعتِ اہلِ حدیث کے امیر (مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم) نے ایسے دعویٰ کو باطل قرار دیا تھا۔ کتاب وسنت کی اصطلاح میں یہ بھی طے نہیں کہ ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے؟۔ نظری طور پر تو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی حیثیت بہر حال فائق ہے لیکن عملاً حدیث کو قرآن پر قاضی قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی جب کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ ہو تو فیصلہ حدیث کے مطابق ہوگا۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

ضابطہ موجود ہی نہیں:۔ پاکستان میں اسلامی قوانین سازی کی بنیادی ذمہ داری اسلامی نظریاتی کونسل کی ہے اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے شعبہ (یا وزارتِ قانون۔ Law ministry) کی۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ نہ نظریاتی کونسل کے پاس اور نہ ہی وزارتِ قانون کے پاس ''سنت'' کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتیٰ کہ وفاقی شرعی عدالت یا سپریم کورٹ کے پاس بھی نہیں۔ اس کے باوجود ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ تمام امور کے فیصلے ''کتاب وسنت'' کے مطابق کریں؟۔ یہ بات تعجب انگیز ہے یا نہیں؟۔'' (اگر کتاب وسنت کے مطابق (پبلک لاز پر) اُمت نے قانون سازی کرنا ہو، یا عدالتوں نے کتاب و سنت کے مطابق فیصلے کرنا ہوں تو (کتاب یعنی قرآن کے ساتھ ساتھ) سنت کا ایک متفقہ ضابطہء قوانین (Code of Sunnah) کا موجود ہونا ضروری ہے۔ موءلف)۔

مطالبہء نفاذِ کتاب و سُنّت:۔ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۸۰ء۔ ص۔۳۵:۔ ''تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ان حضرات (مذہبی پیشواؤں) کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ پاکستان میں (۱)۔ شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنے اپنے ہوں۔ اور (۲)۔ پبلک لاز کا ضابطہ کتاب وسنت کے مطابق مدوّن کیا جائے۔ طلوعِ اسلام نے کہا کہ یہ دونوں مطالبات حقائق کے خلاف ہیں ذرا جذبات سے الگ ہو کر، قرآن مجید کی روشنی میں، علم وبصیرت کی رو سے ان کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ آیا یہ (ا)۔ اسلام کے مطابق بھی ہیں۔ اور (ب)۔ آیا، موجودہ دور میں، یہ ممکن العمل بھی ہیں؟۔ اس کی تفصیل میں جاتے ہوئے ہم نے کہا کہ جہاں تک پہلے مطالبہ کا تعلق ہے:۔

(ا)۔ قرآن مجید کی رو سے، شخصی قوانین اور پبلک لاز کی تفریق غیر اسلامی ہے۔ یہ تفریق ہمارے دورِ ملوکیت کی ایجاد ہے، جب حکومت نے ''دنیاوی امور'' کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اور مذہبی معاملات کو مذہبی پیشوائیت کے حوالے کر دیا تھا۔ اسلامی مملکت میں اس قسم کی ثنویت (Dualism) کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی تقسیم سیکولر نظام میں ہوتی ہے۔

(۲)۔ قرآن کریم کی رو سے، ساری کی ساری امت، ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس نے امت میں فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱)۔ ہر فرقہ کے اپنے اپنے شخصی قوانین کے معنی امت میں فرقوں کے وجود کی گرہوں کو مضبوط ترین کر دینا ہیں (قائدِ اعظم کے الفاظ میں) جب امت کا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک ہے، تو امت بھی ایک کیوں نہ ہو؟۔

(۳)۔ اب آیئے پبلک لاز کی طرف۔ پبلک لاز سے مراد وہ قوانین ہوتے ہیں جن کا اطلاق ملک کے تمام باشندوں (اسلامی

مملکت میں کم از کم تمام مسلمانوں) پر یکساں ہوتا ہو۔ ہم نے کہا کہ کتاب وسنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں ہم نے بڑی تفصیل اور تشریح کے ساتھ مسلسل اور متواتر لکھا۔ اس سلسلہ میں جو دلائل ہم نے پیش کئے، وہ ملخصاً حسب ذیل تھے:۔

(۱)۔ ''کتاب وسنت'' میں کتاب (قرآن مجید) کا لفظ محض تبرکاً رکھ لیا گیا ہے۔ عملاً تمام احکامِ شریعت کے متعلق دعویٰ یہ ہے کہ وہ (بالواسطہ یا بلاواسطہ) سنت پر مبنی ہیں۔ حتیٰ کہ ہماری شریعت میں ایسے احکام بھی ہیں جو صریحاً قرآن مجید کے خلاف ہیں۔ اس کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ سنت، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۲)۔ ''سنت'' کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اس کی تفصیلات تو ایک طرف، اس کے مفہوم تک میں بنیادی اختلاف ہے۔ ایک طبقہ کے نزدیک، سنت، احادیث ہی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ہر حدیث، سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ دوسرے طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر حدیث ''سنت'' نہیں ہے۔ ''سنت'' حضور ﷺ کے اس عمل کو کہا جائے گا جسے آپ ﷺ نے بہ حیثیت رسول ﷺ سرانجام دیا ہو۔ چونکہ احادیث کے مجموعوں میں اس کی کہیں تصریح نہیں کہ حضور ﷺ نے فلاں کام بہ حیثیت رسول ﷺ کیا تھا اور فلاں کام اپنی شخصی حیثیت سے، اس لئے اس کا تعین ہمیں خود کرنا ہوگا۔ اس موضوع پر سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور اس زمانہ کے جمعیت اہل حدیث کے صدر، مولانا محمد اسماعیل مرحوم میں دلچسپ بحث چلی تھی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ۔ ''جماعت اسلامی کا نظریہء حدیث''۔ اور مودودی مرحوم کی کتاب ''تفہیمات'' اور ''رسائل ومسائل'')۔ ظاہر ہے کہ جس بنیاد کا مفہوم تک متعین نہ کیا جا سکتا ہو، اس پر قوانینِ مملکت کی عمارت کس طرح استوار ہو سکتی ہے؟۔

(۳)۔ قرآن کریم ایک متعین اور معلوم کتاب ہے، جسے تمام مسلمان کتاب اللہ مانتے ہیں۔ لیکن پورے عالمِ اسلام میں کوئی ایسی کتاب نہیں جسے تمام مسلمان سنتِ رسول اللہ ﷺ کا مستند اور متفق علیہ مجموعہ تسلیم کرتے ہوں۔ ہر فرقہ کی ''سنت'' الگ الگ ہے۔ یعنی الگ الگ حدیثیں۔ اور الگ الگ کی بھی یہ کیفیت کہ (مثلاً) اہل حدیث حضرات کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کسی بھی حدیث کا انکار انسان کو دائرہء اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اور حنفی حضرات بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو حدیثوں کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ (عملاً) کیفیت یہ ہے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو اسلام کے بنیادی ستون کہا جاتا ہے۔ (زکوٰۃ کی بات بعد میں آئے گی)۔ صلوٰۃ (نماز) کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرقہ کی نماز میں، دوسرے فرقوں کی نماز سے اختلاف ہے۔ اور ہر فرقہ اپنی نماز کو احادیث کے مطابق ثابت کرتا ہے۔ اس اختلاف کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقہ کے پیرو، دوسرے فرقہ والوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے۔ اور مسجدوں کی تخصیص پر مختلف فرقوں میں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔۔ بیس برس تک طلوع اسلام اپنی اس پکار کو دہراتا رہا کہ ''کتاب وسنت'' کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان حضرات میں سے کسی نے طلوعِ اسلام کی کسی دلیل کی تردید نہ کی۔ بیس برس کے بعد مودودی مرحوم کو طلوعِ اسلام کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنا پڑا'' (حوالہء بیان اوپر ''سنت کی بحث'' میں آچکا ہے)۔

کتاب وسُنّت اور فرقہ بندی:۔ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۰ء۔ص۔۵:۔ ''اگر دو سائنٹسٹ، اپنی اپنی لیبارٹری میں کسی فارمولے پر عمل کر رہے ہوں اور ان کا نتیجہ ایک دوسرے سے مختلف ہو، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ دونوں ایک ہی فارمولے پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ دو مختلف فارمولوں پر عمل کر رہے تھے۔ فارمولوں کے اس طرح کے اختلاف کو قرآن کی اصطلاح میں ''شرک'' کہا جاتا ہے۔ اگر ایک فارمولے پر عمل کرنے والوں میں باہمی اختلاف نہیں تو اسے ''توحید'' کہا جائے گا۔ اور اگر ان میں باہمی اختلاف ہوگا تو اسے ''شرک'' سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے، امتِ واحدہ کے فرقوں میں تقسیم ہو جانے کو ''شرک'' کہہ کر پکارا ہے۔ سورہء روم میں ہے:۔ اے جماعتِ مومنین! تم توحید پرست ہو جانے کے بعد، پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی اُن لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ اس فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہم تو حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر (۳۰/۳۲)۔

شرک، کفر، ارتداد:۔ جس قوم میں وحدت نہیں رہتی۔۔۔ وہ گروہوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے، تو اس پر ذلت و خواری کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اختلافات کا یہی وہ مآل ہے جس سے متنبہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ:۔ دیکھنا! کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے باہمی اختلافات کئے اور فرقوں میں بٹ گئے حالانکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے واضح تعلیم آ چکی تھی۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سخت عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں (۳/۱۰۴)۔ اس سے اگلی آیت میں فرقہ بندی اور باہمی اختلافات کو ''کفر بعدِ ایمان'' کہہ کر پکارا گیا ہے (۳/۱۰۵)۔ یعنی سورہء روم میں فرقہ بندی کو شرک کہا گیا ہے اور یہاں اسے کفر بعد از ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہء محمد میں اسے ارتداد (مرتد ہو جانا) کہا گیا ہے۔ (۴۷/۲۴۔۲۵)۔۔ تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ امت میں فرقوں کا وجود شرک ہے، کفر ہے، ارتداد ہے۔

اختلافات کا فیصلہ:۔ یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے رفع کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟۔ اس کے لئے قرآن میں ہے کہ:۔ **وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ** (42:10)۔ ''جس بات میں تم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لے لیا کرو۔'' کتاب اللہ کے نازل کرنے سے مقصد یہی تھا کہ یہ اختلافی امور میں واضح طور پر بتا دے کہ صحیح بات کیا ہے (۱۶/۸۹)۔ لیکن اختلافی معاملات میں قرآن سے فیصلہ لینے کی صورت یہ نہیں کہ فریقین اپنے اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ لینے لگ جائیں۔ اس کے لئے خدا نے ایک عملی نظام مقرر کیا تھا۔ اور وہ عملی نظام یہ تھا کہ فریقین ایک ثالث کے پاس جائیں اور اس کے فیصلہ کو بہ طیبِ خاطر منظور کریں۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ ارضی میں یہ ثالث خود رسول اللہ ﷺ تھے، جو بحیثیتِ مرکزِ حکومتِ خداوندی جملہ اختلافی امور کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔

عملی طریق:۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ:۔ ''تیرا رب اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات میں (اے رسول ﷺ!) تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کریں۔ اور پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ جو کچھ تو فیصلہ کرے اس کے خلاف یہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ دل و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کے سامنے سرِ تسلیم

ختم کردیں۔'' (۴/۶۵)۔ اسی سورہ میں دوسرے مقام پر اس عملی نظام کی تصریح ان الفاظ سے کردی کہ جماعتِ مومنین کے لئے ضروری ہے کہ یہ اللہ، اس کے رسول اور اُن افسرانِ ماتحت کے احکام کی اطاعت کریں جنہیں اس مقصد کے لئے تعینات کیا گیا ہو۔ پھر اگر کسی کو ان افسرانِ ماتحت کے کسی فیصلے سے اختلاف ہو تو وہ اس کے خلاف ''خدا اور رسول'' (مرکزی حکومتِ خداوندی) کے ہاں اپیل کرسکتا ہے۔ لیکن مرکز کا فیصلہ آخری ہوگا (۴/۵۹)۔ حتیٰ کہ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ مملکت میں خوف یا امن سے متعلق کوئی بات بھی ان تک پہنچے تو یہ اسے اپنے طور پر نہ لے اُڑا کریں۔ انہیں چاہیئے کہ اسے افسرانِ ماتحت یا مرکزی حکومت (رسول) تک پہنچائیں تاکہ وہ مناسب تحقیق و تفتیش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ کر فیصلہ کریں (۴/۸۳)۔ یہ تھا وہ عملی نظام جسے اختلافات رفع کرنے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ یعنی افرادِ امت ہر اختلافی معاملہ کے لئے حکومت کے نمائندگان کی طرف رجوع کریں۔ افرادِ امت سے تو یہ کہا۔ اور فیصلہ دینے والی اتھارٹی کو اس کی تاکید کی گئی کہ:۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ یعنی لوگوں کے متنازعہ معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو (۵/۴۸)۔ یہ تھا وہ نظام جو امت میں وحدت قائم کرنے اور اسے اختلافات کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

اسے قرآن کی اصطلاح میں ''الدین'' اور عرفِ عامہ میں ''اسلامی مملکت'' کہا جاتا ہے۔ جب تک یہ نظام قائم رہا امت میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا اور نہ کوئی فرقہ۔ جب یہ نظام بگڑا تو مسلمان اس مقام پر آگئے جس مقام پر، اسلام سے پہلے، اہلِ کتاب تھے۔ ان کا ''الدین'' ''مذہب'' میں تبدیل ہوگیا۔ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت آگئی، مرکزیت کی بجائے انتشار پیدا ہوگیا۔ ان میں کوئی ایسی اتھارٹی نہ رہی جو ان کے اختلافی معاملات میں حَکَم بن سکے۔ امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ اور ہر فرقہ اپنی اپنی شریعت (فقہ) پر عمل کرنے لگ گیا۔ قرآن نے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں، ایک قانون پر عمل کرنے کی بجائے مختلف قوانین پر عمل کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کردی تھی کہ:۔ ''الدین میں مختلف شریعتیں دینے والے درحقیقت خدا کے شریک ہیں۔'' (۴۲/۲۱)۔ مسلمانوں میں یہی کیفیت اِس وقت تک چلی آرہی ہے۔ یعنی ان کے ہاں امت کا تو وجود ہی نہیں رہا، صرف فرقے موجود ہیں۔ فرقوں کی موجودگی میں اسلام باقی نہیں رہتا۔'' (اس سے آگے بتایا گیا ہے کہ اس کی وجہ احادیث وغیرہ پر مسلمانوں کا غیر مشروط ایمان ہے)۔ پھر لکھا ہے کہ:۔ ''قرآن تو ساری امت کے پاس ایک ہی تھا لیکن روایات یا احادیث یا سنتِ رسول اللہ ﷺ ہر فرقے کی الگ الگ تھیں۔ ان سے مختلف شریعتیں (مختلف فرقوں کی فقہیں) مرتب ہوئیں۔ یہ فقہیں تھیں تو الگ الگ لیکن ہر فرقہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ''کتاب وسنت'' کے مطابق ہیں۔ ''کتاب وسنت'' کی اصطلاح میں لفظ تو ''کتاب'' کا پہلے آتا ہے لیکن عملاً مقدم حیثیت ''سنت'' یعنی روایات کو حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر فرقہ قرآن کی آیات کا وہی مفہوم قابلِ قبول قرار دیتا ہے جو اس فرقے کے ہاں کی روایات کی رو سے متعین کیا جائے۔ (یہ ۱۹۷۰ء کی تحریر ہے۔ بعد میں، صدر جنرل ضیاء الحق کے دور ۸۸۔۱۹۷۷ء میں آئینِ پاکستان کے آرٹیکل نمبر ۲۲۷ میں اسی طرح کی۔ غیر قرآنی یعنی سیکولر۔ ترمیم کردی گئی جو آج تک ہمارے آئین کا حصہ ہے۔ مؤلف)۔ حتیٰ کہ جہاں قرآن کی کسی آیت اور روایت میں اختلاف ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جاتا ہے اور عمل روایت کے مطابق ہوتا ہے۔ مختصراً، صدیوں سے امت کی کیفیت یہ ہے کہ:۔ (۱)۔ اختلافی معاملات میں حَکَم بننے والی

اتھارٹی (اسلامی حکومت) غائب ہے۔(۲)۔ ہر فرقہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کا عمل ''کتاب وسنت'' کے مطابق ہے لیکن درحقیقت اس کی شریعت کا مدار روایات پر ہے اور روایات ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔

تجزیہء اصطلاح:۔ آپ ''کتاب وسنت'' کے مطابق عمل پیرا ہونے کے دعویٰ کا تجزیہ کریں گے تو آپ کے سامنے عجیب صورت آئے گی۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب اگر مسلمانوں کے ہر فرقہ کے اس دعویٰ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عمل قرآن کے مطابق ہے تو اس سے لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ جس کتاب سے مختلف فرقوں کو اس قدر مختلف احکامات مل سکتے ہوں اس کا یہ دعویٰ کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں؟۔ لہٰذا، یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ مبنی برحقیقت نہیں اور اگر خدا کا دعویٰ سچا ہے (اور اس کے سچا ہونے میں کس مسلمان کو شک ہو سکتا ہے) تو پھر لازماً اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ ان فرقوں کا یہ دعویٰ سچا نہیں کہ ان کا عمل مطابق کتاب اللہ ہے۔ ان فرقوں سے پوچھئے کہ ان کے نزدیک ان دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟۔ اب آیئے اتباعِ سنت کے دعویٰ کی طرف۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ:۔ ''جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں۔ اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھیں تو (اے رسول ﷺ!) تیرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔'' (۶/۱۶۰)۔ اس سے واضح ہے کہ فرقوں میں بٹی ہوئی امت کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا، ان کا یہ دعویٰ کہ یہ ''سنتِ رسول اللہ ﷺ'' کا اتباع کرتے ہیں، باطل ہے۔

یہ ہے اعتصام بکتاب وسنت کے دعویٰ کی حقیقت!۔ قیامِ پاکستان کے بعد، ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا جس کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی جائے گی (ملاحظہ ہوں علماء کے بائیس نکات۔ ۱۹۵۱ء)۔ جن لوگوں کی نگاہ قرآنی تعلیمات پر تھی وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ:۔(۱)۔ اسلامی نظام میں، ساری قوم امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ اس میں فرقوں کا وجود نہیں ہوتا۔(۲)۔ اسلامی نظام میں، ضابطہ قوانین ایک ہی ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام افرادِ امت پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس، ہماری مذہبی پیشوائیت، اسلامی نظام کا یہ نقشہ پیش کرتی تھی کہ:۔(۱)۔ مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں کا وجود آئینی طور پر تسلیم کیا جائیگا۔(۲)۔ شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے۔(۳)۔ ملکی قوانین کتاب وسنت کی رو سے مرتب کئے جائیں گے۔ اس سے یہ تاثر دیا جانا مقصود تھا کہ کتاب وسنت کی رو سے ملکی قوانین ایسے مرتب ہو سکتے ہیں جنہیں تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

طلوعِ اسلام نے کہا کہ اول تو جس نظام میں، امت فرقوں میں بٹی رہے اور مسلمانوں کے شخصی اور ملکی قوانین میں تخصیص وتمیز کی جائے، وہ نظام قرآن کی رو سے اسلامی کہلا ہی نہیں سکتا۔ اور ثانیاً یہ دعویٰ یکسر فریب پر مبنی ہے کہ کتاب وسنت کی رو سے ملکی قوانین ایسے مرتب ہو سکتے ہیں جنہیں تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ ایسا قطعاً ناممکن ہے۔ اس پر طلوعِ اسلام کے خلاف وہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ توبہ بھلی۔ اور اب بائیس تیئس برس کے پُرفریب پروپیگنڈہ کے بعد انہیں بالآخر اعتراف کرنا پڑا کہ:۔ ''کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔'' (مودودی مرحوم)۔''

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اس سے نکلنے کا طریقہ

محترم اعجاز ذکا سیّد صاحب کے فکر انگیز مضامین مشہور اخبار ''دی نیوز'' میں کافی عرصہ سے طبع ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مرتبہ مورخہ 28 اپریل کے اخبار میں ان کا جو مضمون طبع ہوا ہے اس میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''مسلمانوں کے زوال کی یہ وجہ ہے کہ نہ تو ان کے پاس کوئی Vision ہے اور نہ ہی یہ تیزی سے بدلتے ہوتے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں''۔ محترم اعجاز صاحب کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس موجودہ دور میں مسلمانوں کی حالت اِس درجہ تباہ کن اور قابل رحم ہوگئی ہے کہ جب بھی چار مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں، اپنی بربادی کا مرثیہ شروع کر دیتے ہیں اور اِس تباہی سے نکلنے کے لئے کسی کے پاس کوئی وژن نہیں ہے۔ ہم اس مضمون میں ویژن پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہمارا پڑوسی ملک چین ہم سے دو سال بعد آزاد ہوا۔ آزادی کے وقت اِس کی حالت ہم سے کوئی بہتر نہیں تھی بلکہ بدتر ہی تھی۔ 65 سال کے بعد آج چین جس مقام پر کھڑا ہے اور ہم جس حالت میں ہیں، یہ موازنہ بڑا عبرتناک، چشم کشا اور فکر انگیز ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے قرآن (اسلام) کو چھوڑ دیا ہے اس لیے مسلمانوں کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ لیکن اصل غور طلب بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا کیوں؟ قرآن پر ہمارا ایمان ہے ہم اُسے وحی الٰہی بھی مانتے ہیں۔ اس کے کئے ہوئے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ صدر اوّل میں اس پر عمل کرنے کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ بہت ہی خوشگوار تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ بظاہر ہم قرآن کو پکڑے ہوئے بھی ہیں۔ جگہ جگہ ترتیل القرآن، تجوید القرآن کے مکاتب موجود ہیں۔ تراویح، شبینے، ختم القرآن کی محفلیں، سب کچھ موجود ہیں۔ آپ ایک نگاہ پھر چین پر ڈالیں انہوں نے تو کوئی قرآن نہیں پکڑا لیکن برابر ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ نیز یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں اس وقت مسلمانوں کے تقریباً 57 آزاد ممالک ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے تمام ملکوں کی حالت یہی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو موجودہ حالات سے الگ (Detach) کر کے معروضی طور پر غور کرے، تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ مسلمانوں کے 56 ممالک کے زوال میں قدرِ مشترک (Common Factor) ان کے مذہبی خیالات ہیں۔ اور مسلمانوں کے زوال کا سبب مذہبی غلبہ ہے۔

ہمارے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کا نفاق ان کی فکری ژولیدہ نگاہی ہے۔ ہمارے سامنے ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم

مذہب کو بالکل تیاگ دیں اور چین کی طرح صرف عقل انسانی پر بھروسہ کر کے اپنے مسائل خود حل کریں۔ ہمارے ہاں مفکرین کی کمی نہیں ہر شعبے میں ہمارے ہاں Talent بھرا پڑا ہے اور پھر مذہب کی طرف بالکل رُخ نہ کریں۔ لیکن اس کے لئے بڑی جرأت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم قرآن پر عمل کریں۔ لیکن قرآن پر اس طرح عمل کریں جس طرح قرآن ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ اور اس پر عمل کرنے کے جو نتائج برآمد ہوں ان کو ہر وقت سامنے رکھ کر یہ اندازہ کرتے چلیں کہ کیا ہم اس پر درست عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ قرآن اپنے احکامات وقوانین پر عمل کرنے کی حکمت ساتھ ساتھ بیان کرتا چلتا ہے۔ اس نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس قانون پر عمل کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآنی قوانین پر عمل کرنے سے قرآن کے بیان کردہ نتائج نکل رہے ہیں۔ اگر قرآن پر عمل کرنے سے اس کے بیان کردہ نتائج نکل رہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر قرآن کا مقرر کردہ نتیجہ نہیں برآمد ہو رہا ہے تو ہمیں فوراً احساس کرنا چاہئے کہ ہم غلط عمل کر رہے ہیں۔ اور اس عمل کو فوری طور پر ترک کر دینا چاہیئے۔ قرآن کریم نے اقامت صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ فحشا اور منکر سے بچنا بیان کیا ہے۔ لیکن اگر صلوٰۃ فحشا ومنکر سے نہیں روکتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اقامت صلوٰۃ نہیں کر رہے ہیں۔ ہم نے اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ''نماز پڑھنا'' کیا' اور یہ توقع رکھی کہ نماز فحشا ومنکر سے روک دے گی۔ لیکن نماز نے کسی کو بھی فحشا ومنکر سے نہیں روکا۔ نماز یا پرستش کی کسی رسم کی Jurisdiction میں یہ بات ہے ہی نہیں کہ وہ رسم برائی سے روکے۔ عقلمندی کا تقاضہ تھا کہ ہم صلوٰۃ اور نماز کے باہمی تعلق پر غور کرتے۔ ہم نے یہ نہیں کیا۔ باوجود اس کے کہ نماز کے کوئی نتائج برآمد نہیں ہوئے ہم نے اس کو جاری رکھا اور نتائج برآمد نہ ہونے کی یہ تاویل دی کہ چونکہ ہم نماز دل سے نہیں پڑھتے اس لئے نماز برائی سے نہیں روکتی۔ دل سے پڑھنے کے لئے یہ ہے کہ جب آدمی نماز پڑھے تو اس کا خیال اللہ کے علاوہ کسی اور طرف نہ جائے۔ لیکن یہ بات نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ انسانی ذہن تصورات سے خالی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح حج کا معاملہ ہے۔ قرآن کریم نے حج کے دو مقاصد بیان فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حج کا مقصد یہ ہے کہ حج کے ذریعے قانونِ خداوندی کو بلند کیا جائے۔ تاکہ تم اللہ کے قانون کو بلند کرو اس بات کے عوض میں کہ اللہ نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے' حج کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ حج کے دوران مسلمان غیر مسلموں کو فائدہ پہنچانے کے لئے کچھ تجاویز پر غور وفکر کریں اور غیر مسلم وہ تجاویز جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ لیکن صدیاں گذر گئیں اور حج کے یہ دونوں مقاصد حاصل نہیں ہو رہے ہیں لیکن حج کا سلسلہ جاری ہے۔ حج اسلامی نظام میں بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ یہ اسی نظام کا ایک رُکن تھا۔ اب تماشہ یہ ہے کہ اس نظام کو منقرض ہوئے صدیاں گذر گئیں' لیکن اس کے اس رُکن کو جاری رکھا ہوا ہے۔ لاکھوں مسلمان نہایت خلوصِ دل سے حج کرتے ہیں۔ بعض غریب مسلمان اپنی ساری عمر کی پونجی اس پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن حج سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ سوائے اس کے کہ حکومت کے محکمے لاکھوں روپے کا غبن کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہم مسلمان قرآن پر اس طرح عمل کرنے لگیں تو بیشک مسلمانوں کے حالات بدل سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کے قوانین پر عمل

کرنے کے نتائج صرف اِس کے نظام سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے جو وعدے کئے ہیں وہ صرف اس کے نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ آپ قرآن کریم کا نظام ایک مرتبہ جاری کریں پھر آپ دیکھیں کس طرح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کا یہ خاصہ ہے کہ پھر لوگ اسلامی نظام میں فوج در فوج شامل ہوتے ہیں۔ یہی صدر اوّل میں ہوا اور یہی آج ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کا نظام عملاً جاری کرنا ہر نبی کا فرض تھا اسی طرح رسول اللہ پر بھی اس نظام کو جاری رکھنا فرض تھا۔ حضور نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں یہ نظام جاری فرمایا۔ حضور کے دور میں یہ نظام دس لاکھ مربع میل پر وسیع و عریض تھا۔ اگر قرآنی نظام قائم کرنا حضور کے Mandate میں شامل نہ ہوتا تو حضور یہ نظام کیوں قائم فرماتے۔ مکہ میں ہی پرستش کی چند رسوم ادا کرتے رہتے۔ لیکن حضور نے اِس نظام کو قائم کرنے میں بڑی قربانیاں پیش کیں۔ حضور نے مشرکین و کفار عرب سے 82 لڑائیاں لڑیں اور بالآخر نظام قائم کر کے ہی چھوڑا۔ ہم چونکہ کتاب اللہ کے وراث ہیں اِس لئے ہم مسلمانوں پر بھی فرض ہے کہ ہم قرآن کا نظام جاری کریں۔ جو مسلمان سیکولر مملکت کے قائل ہیں انہیں بخوبی واضح ہونا چاہئے کہ قرآن کے نزدیک ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ اسلامی نظام کا قیام ہے۔ اگر آپ اسلامی نظام سے اجتناب چاہتے ہیں' تو آپ کو ایمان اور اعمال صالحہ سے بھی اجتناب کرنا ہوگا اسلامی ارکان جن پر ہم انفرادی طور پر عمل کر رہے ہیں وہ صرف اسلامی نظام میں ہی ادا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اقامت صلوٰۃ کی تعمیل کے لئے ہم نماز پڑھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اقامت صلوٰۃ کے لئے غلبہ شرط ہے۔ اس کا ثبوت ہم اپنی طرف سے نہیں دیتے۔ اس کے لئے ہم جلالین سے ایک آیت کی ترکیب نحوی پیش کرتے ہیں۔ ارشاد عالی ہوتا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41)۔ (ترجمہ) وہ لوگ کہ اگر ان کو ملک میں قدرت دیں تو یہ نماز قائم رکھیں۔ زکوٰۃ دیں' بھلے کام کا حکم کریں اور برائی سے منع کریں آپ غور فرمائیں ترجمہ میں بھی صلوٰۃ کے لیے ''ملک میں قدرت رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اب ہم اس آیت کی ترکیب نحوی جلالین سے نقل کرتے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صلوٰۃ کے لئے اقتدار کا ہونا شرط ہے۔ جلالین میں مرقوم ہے ''ان مکنا میں جو شرط تھی، اقاموا الصلوٰۃ اور اس کے بعد کا جملہ' اس شرط کا جواب ہے۔ نیز شرط اور جواب شرط' دونوں صلہ ہیں الذین موصول کے۔ اس سے قبل ایک مبتداء محذوف ہے یعنی ہم۔ (اقتباس)۔ نحوی قواعد میں یہ بھی ہے کہ اذا فات الشرط فات المشروط۔ اگر شرط باقی نہ رہے تو مشروط بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ اگر شرط یعنی اقتدار اور تمکن فی الارض حاصل نہیں ہے' تو اقامت صلوٰۃ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم مسلمان تو ہندوستان اور انگلینڈ میں بھی نماز ادا کرتے ہیں' جہاں مسلمانوں کو تمکن ہی حاصل نہیں' اور اسی نماز کو صلوٰۃ سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ آیت میں زمین پر اقتدار شرط قرار دیا گیا ہے اگر اس آیت میں فی الارض کے الفاظ نہ ہوتے تو ہماری پیشوائیت اِس کو فوراً روحانی تمکن قرار دے دیتی۔

یہاں تک یہ بات بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کے موجودہ مذہبی نظریات ہیں جو قرآن کے بالکل خلاف ہیں اور اس کا علاج قرآن کریم کا نظام قائم کرنا ہے۔ اب آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ اسلامی نظام کے قیام میں کیا کیا موانعات

ہیں۔ نظام کے قیام میں جو موانع ہیں وہ ہی مسلمانوں کے زوال کے اسباب ہیں۔

اسلامی نظام کے قیام میں جو موانع ہیں ان میں سرفہرست تھیوکریسی کا تصور ہے۔ ہمارے عوام اسلامی مملکت اور تھیوکریسی کو ایک ہی طرز کی حکومت خیال کرتے ہیں۔ تھیوکریسی خود چونکہ بدترین نظام حیات ہے اور لوگ تھیوکریسی اور اسلامی مملکت کو ایک سمجھتے ہیں اس لیے وہ اسلامی مملکت سے بھی تنفر کرنے لگتے ہیں۔ تھیوکریسی کا تصور عیسائیت کا تصور تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات 'پوپ Cardinals اور کلیسا کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اِس کا نام ان کے ہاں Divine Rights تھا۔ اور اِس میں چرچ کی حکومت ہوتی تھی' مسلمانون نے بھی یہ تصور اُن کے ہاں سے لیا اور بادشاہ کو السلطان ظل اللہ فی الارض قرار دیا۔ لیکن یہ تصور قرآن کے خلاف ہے۔ اسلام کے نزدیک تو انسان کی حکومت انسان پر بالکل حرام ہے (3:79) اور حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ جو لوگ دوسروں پر حکومت کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔ اور حاکم بننا چاہتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے وہ اللہ تعالیٰ کے مدمقابل کھڑے ہوتے ہیں اور قرآن نے اُنہیں انداداً من اللہ کہا ہے (2:22)۔ قرآن ان کو مجرموں کا سردار بھی کہتا ہے (6:123)' اسی لئے اسلامی نظام اور تھیوکریسی میں فرق کرنا چاہیئے۔ تھیوکریسی کے نقائص ومصائب کی وجہ سے اسلامی نظام کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔

اسلامی نظام کے قیام میں دوسرا مانع روح اور روحانیت کے خلاف قرآنی تصور ہے۔ قرآن کریم میں نہ تو روحانیت کا لفظ آیا ہے اور نہ ہی قرآن روحانیت کا قائل ہے۔ روحانیت کا تصور وضعی روایات کا پیدا کردہ ہے' اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ یہ تین روایات ملاحظہ فرمائیں۔

(1) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ پس اس کی پشت سے ارواح نکلیں جن کا اللہ خالق ہے آدم کی اولاد سے قیامت کے دن تک (مشکوۃ شریف)۔

(2) مسلم بن یسار سے روایت ہے، اس نے کہا کہ عمرؓ بن خطاب سے پوچھا گیا اس آیت کے بارے میں وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (7:172)۔ کیا عمر نے یہی سنا رسول اللہؐ سے جب آپ سے سوال کئے گئے اسی آیت سے' پس آپ (عمر) نے فرمایا کہ تحقیق پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آدم کو پھر داہنا ہاتھ پھیرا اس کی پشت پر نکلی اس سے اولاد (مشکوۃ' باب الایمان بالقدر)

(3) حضرت ابودرداء سے روایت ہے انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا پس ہاتھ پھیرا اس کے دائیں شانہ پر تو نکالی سفید فام اولاد مور چہ کی مانند اور ہاتھ پھیرا اس کے بائیں شانہ پر' تو نکالی اولاد کوئلوں کی مانند۔

ان تین روایات' اور اسی مضمون کی چند دیگر روایات کی بناء پر ہمارے علماء کرام نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ دنیا کی تخلیق کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے ارواح کا ایک ذخیرہ بنا لیا تھا اور ان تمام ارواح سے اپنی توحید کا اقرار لیا۔ اس کو یوم میثاق' یوم ذر' اور یوم الست کہا جاتا ہے۔

ہمارے مذہبی طبقہ کے نزدیک اس روح کا تزکیہ ہی انسان کا مقصد حیات ہے۔ روح کے تزکیہ کے نظریہ کی وجہ سے مسلمان تباہ

حال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے قرآن میں روحانیت کا کوئی تصور نہیں ہے اِس سے قرآن میں تزکیہ روح کے طریقوں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ روح کے قائلین نے خود یہ نظریہ وضع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کرنے سے تزکیہ روح حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے دنیا اور دنیاوی معاملات کو ترک کرنا ضروری سمجھا' اور جنگل' پہاڑ' کونوں' کھدروں' گوشوں' زاویوں میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔ تزکیہ روح کے نظریہ سے دنیا سے تنفر پیدا ہوتا ہے اور دنیا کی طرف سے ایک Negative Attitude پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ خود غور فرمائیں جس قوم کی ذہنی ساخت ہی دنیا سے نفرت پر استوار ہوتی ہو۔ وہ قوم جس قدر بھی برباد ہو کم ہے۔ رُوحانیت کے عقیدہ سے ہی اولیاء اللہ' مقابر، زیارت گاہوں' عرس' وغیرہ کا تصور وابستہ ہے۔ اگر روحانیت کا تصور باقی نہ رہے' تو ان بڑے بڑے اولیاء اللہ کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ہے۔

قرآن کریم میں روح کا لفظ بیشتر مقامات پر آیا ہے یہ لفظ وحی کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور ہمارے علمائے کرام نے بھی بعض مقامات پر اِس کا ترجمہ وحی ہی کیا ہے۔ جس آیت میں وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِهِ (32:9) کے الفاظ آتے ہیں' اسی آیت کے اگلے حصہ نے اِس کی خود وضاحت کر دی ہے' کہ نفخ روح کا مطلب یہ ہے کہ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (32:9) 'یعنی نفخ روح کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو سمع و بصر یعنی ذرائع علم عطا کیے گئے۔ روح خداوندی سے مراد ایک توانائی' اور ایک جوہر ہے جسے قرآن نے انسانی ذات قرار دیا ہے' جس سے ساری انسانی خصوصیات وابستہ ہیں' اور قرآن نے اِس کے لئے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ہمارا مذہبی طبقہ جسم انسانی کے ساتھ روح کو مانتا ہے جو اِس جسم کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ لیکن قرآن نے اس کے لئے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے محترم قارئین کرام کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب جسم انسانی کے ساتھ کسی دوسری چیز کو ماننا ضروری ہے تو روح کو مان لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن ایک تو یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روح کے اقرار سے قوم زوال پذیر ہوتی ہے' جیسا کہ اوپر واضح کر دیا گیا ہے' لیکن اس کے برعکس نفس کے تصور سے قوم عروج اور سرفرازی حاصل کرتی ہے۔ نفس کی پرورش کرنا' ہر شخص کا مقصد حیات ہے اور اس کے تزکیہ کے جو اصول قرآن نے بیان کئے ہیں' اس سے ایک بہترین معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ نفس کا تزکیہ صرف معاشرہ میں رہ کر ہی ہو سکتا ہے کیونکہ دوسروں کا تزکیہ کرنے سے اپنا تزکیہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے زوال کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے اطاعتِ خداوندی اور اِس کی پرستش میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جو قوم اللہ و رسول کی اطاعت ہی نہیں کر رہی ہے' وہ اس کی اطاعت کے نتائج کس طرح حاصل کر سکتی ہے۔ ہمارا دیندار' متقی و پرہیزگار طبقہ مسجد میں جا کر نماز' نوافل' وتر' تہجد کی رسومات کے ذریعے اللہ کی پرستش کرتا ہے۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی وہ ٹریفک لائٹ کی اطاعت کرتا ہے' یہ طبقہ پرستش اللہ کی کرتا ہے' لیکن اطاعت اِس نظام کی کرتا ہے جو انسانوں کا وضع کردہ ہوتا ہے اور جس کی اطاعت جرم ہے' اور جس نظام کے نتائج نہایت انسانیت سوز ہوتے ہیں۔ اگر یہ اطاعت بھی اللہ کی کرنے لگیں' تو اس کے لئے انہیں لازماً اسلامی نظام قائم کرنا ہوگا۔ جو اُن کی سرفرازی اور سربلندی کا ضامن ہوگا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کیونکہ یہ بڑی اہم بات ہے کہ پرستش کسی کی کرنا' اور اطاعت کسی اور کی کرنا'

دونوں باتوں میں ایک کھلا تضاد ہے۔ جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہوسکتا ہے، جو فاتر العقل ہے۔ اور مسلمانوں کا یہی وہ نفاق ہے جس کی سزا وہ آج بھگت رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ پرستش کرنے میں بڑا Charm ہے کیونکہ اِس کو سرانجام دینا آسان بھی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونبیوں نے بیک وقت قوم کی اصلاح کی اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے ان کی تربیت کی۔ لیکن اسی دوران حضرت موسیٰؑ جب چند روز کے لئے اپنی قوم سے الگ ہوئے، تو سامری نے پوری قوم کو پرستش کی طرف آمادہ کردیا۔

ہر وہ عقیدہ جو اسلامی نظام کے قیام میں مانع ہے وہ مسلمانوں کے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ حضورؐ نے دس لاکھ مربع میل زمین پر اسلامی مملکت قائم فرمائی۔ اس مملکت میں آپ نے حکام (2:188) اور اولوالامر مقرر فرمائے (4:59) ان حکام اور اولوالامر کی اطاعت عبادتِ خداوندی تھی۔ حضورؐ کی حیات کے دوران اِس نظام کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت ہورہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حضورؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ ہمارے علماء کرام نے روایات کو حضورؐ کی اطاعت کا ذریعہ قرار دیا اور اسی وجہ سے انہوں نے روایات کو بھی وحی کا درجہ دیا۔ اطاعتِ رسول کے اس طریقے میں اسلامی نظام کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تیرہ سو سال سے، حضور کی اطاعت اسی طرح ہوتی چلی جارہی ہے۔ تحریک طلوع اسلام پہلی تحریک ہے جس نے حضورؐ کی اطاعت کو روایات کے بجائے اسلامی مملکت کے سربراہ کی طرف منتقل کیا ہے۔ تحریک طلوع اسلام کے نزدیک رسول اللہ کی وفات کے بعد، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ جب تک آپ اس اطاعت کو اسلامی مملکت کے سربراہ کی طرف منتقل نہیں کریں گے، نہ کسی اسلامی نظام کی ضرورت باقی رہے گی، اور نہ ہی اسلامی نظام قائم ہوسکے گا، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پرستش کے ذریعے ہی ہوتی رہے گی۔

مسلمانوں کے ان تمام مصائب وتنزل کا حل یہ ہے کہ وہ انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے حیات کو چھوڑ کر، اپنا قرآنی نظام قائم کریں۔ یہ ایک اصولی اور بدیہی بات ہے کہ جب آپ یہ اصول تسلیم کرلیں کہ اقتدار کا سرچشمہ خود عوام ہیں، اور انسانوں کو ہی اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے تو اِس اصول کو تسلیم کرلینے کے بعد آپ جو نظام بھی قائم کریں گے، اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے وہ سب نظام ایک ہی نوعیت کے ہوں گے نظام ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ لیکن اقتدار اعلیٰ کے حاصل ہونے کے اعتبار سے دونوں ایک نوعیت کے ہیں۔ دونوں نظاموں میں انسانوں کو قانون سازی کا مطلق اختیار ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ملوکیت میں وہ حق صرف ایک آدمی کے پاس ہوتا ہے اور جمہوریت میں اِس حق کو بہت سے لوگوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ دونوں نظاموں کی اصل خرابی اور خامی یہ ہے کہ ان دونوں میں اطاعت اپنے ہی جیسے انسانوں کی ہوتی ہے۔ جبکہ قرآن کریم کے نظام کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اِس نظام میں اطاعت قانون کی ہوتی ہے۔ کسی فرد کو اِس بات کا حق نہیں کہ وہ خود قانون بنا کر دوسرے انسانوں سے اس قانون کی اطاعت کرائے۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے خود نبیؐ کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب اور حکومت

عطا کی گئی ہو اس کو بھی اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے اپنی اطاعت کرائے (3:79)۔ حضور اکرمؐ جو کہ مملکت کے سربراہ تھے انہیں قانون سازی کا کوئی حق نہیں تھا۔ ارشاد ہوا: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (5:48) 'جو قانون اللہ کی طرف سے نازل کر دیا گیا ہے اسی کے مطابق فیصلے کرو۔ حضور خود اسی منزل میں اللہ کے قانون کی سب سے زیادہ اطاعت فرماتے تھے (7:203, 6:50)۔ اُنہیں اس بات کا اختیار نہیں تھا کہ وہ اِس قانون میں کوئی ردوبدل کر سکیں' قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي (10:15)' اے رسول کہہ دو کہ مجھے اس بات کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اِس قانون میں کوئی ردوبدل کر سکوں۔

اسلامی نظام میں قرآن کریم اس کا کانسٹی ٹیوشن ہوتا ہے اور قرآن کریم کی اطاعت بذریعہ نظام کی جاتی ہے۔ اسلامی نظام میں اطاعت کی تین کڑیاں ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتیں۔ اور یہی بات اس چیز کی دلیل ہے کہ اس میں اطاعت افراد کی نہیں بلکہ قانون کی ہوتی ہے یہ تین کڑیاں اللہ' رسول' اور اولوالامر کی ہیں (4:59)۔ اس نظام کو چلانے والے اولوالامر رسول کے مقامی نائب ہوتے ہیں' اسی وجہ سے ان کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ سورہ النساء کی آیت جس کا حوالہ اوپر والی سطر میں دیا گیا ہے اس میں اولوالامر ایسے ہی اُولوالامر ہیں۔ جو شخص ایسے اولوالامر کی اطاعت سے انحراف کرے گا' وہ اللہ و رسول کی معصیت کا مرتکب ہوگا۔ اس نظام میں ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے (17:31, 6:151, 11:6)۔ اس کے علاوہ اِس نظام میں ہر شخص کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی ہے۔ مملکت کے ہر شہری کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کرنا بھی حضورؐ کے فرائض میں شامل تھا وَيُزَكِّيهِمْ (2:129, 2:151)۔ اسلامی نظام کی اساس اسماء الٰہی پر ہوتی ہے۔ چونکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ صفات خداوندی کو اپنی ذات میں پوری پوری طرح منعکس کرے' اس لئے اس انعکاس سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ غیر اسلامی نظام میں چونکہ صفات خداوندی کا انعکاس نہیں ہوسکتا' اس لیے انسانوں کی صلاحیتیں بھی برومند نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل ہے۔ اسلامی مملکت کے لئے یہ حکم ہے کہ عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے (5:8)۔ اسلامی نظام میں' اس کے شہریوں میں عدل کی صفت خود بخود پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ جس معاشرہ کا قیام ہی انسانی وضع کردہ' ظلم پر مبنی قوانین پر ہوگا' اِس کے شہریوں میں اس صفت خداوندی کا انعکاس نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ' رب العالمین ہے' اس مملکت کے ہر شہری میں ربوبیت کی صفت از خود پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے' وہ عفو ہے' رحیم ہے' رحمٰن ہے۔ اسلامی مملکت کی اساس ہی ان صفات پر ہوگی' اس لئے اسلامی مملکت خود بھی ان صفاتِ عالی سے مملو ہوگی۔ اور اس کے شہریوں میں بھی یہ صفات ہوں گی' اس طرح ہر شہری کی پوری پوری صلاحیتیں برومند ہوں گی۔ اور یہی تزکیہ نفس ہے۔ یہاں آپ روح کے تزکیہ اور نفس کے تزکیہ کا تفاوت ملاحظہ فرمائیں۔ ہر شہری کا فرض ہوگا کہ وہ خود کو صفات الٰہی کے تقاضوں کے مطابق بنائے۔ اللہ تعالیٰ منعم ہے' اس کی صفت کا تقاضہ یہ ہے کہ مملکت کا ہر فرد زیادہ سے زیادہ مال دوسروں پر خرچ کرے' اور مملکت اِس تقاضہ کو اس طرح پوری کرے گی وہ اپنے شہریوں کی کفالت کرے گی۔ یہ صفات صرف اسلامی نظام میں ہی نشوونما پاسکتی ہیں کیونکہ اس کی بنیاد صفات خداوندی پر ہوتی ہے۔ باطل کے نظام کو یہ چیزیں میسر نہیں ہوسکتیں۔ سیکولر مملکت کا دائرہ عمل

انسانوں کے جسم تک محدود ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذات کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اسلامی مملکت انسانی جسم اور انسانی ذات دونوں کے مسائل حل کرتی ہے۔ اسلامی مملکت میں دوسروں کی ذات کی پرورش کرنے سے اپنی ذات کی پرورش ہوتی ہے۔ انسانی ذات میں مالیت پیدا کرنے کا By Product معاشرے کی اصلاح ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں معاشرہ کی اصلاح کی ضرورت ہی نہیں پڑتی' وہ سالمیت کے نتیجہ میں ازخود درست ہوتا چلا جاتا ہے۔ طاغوتی اور باطل نظام کی بنیاد غلط اصولوں پر ہوتی ہے۔ قرآن کی رُو سے باطل نظام کے قوانین' ظلم، کفر اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں (5:47, 5:45, 5:44)۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے کسی بھی مملکت کی اطاعت مشروط ہوتی ہے۔ اگر مملکت صفات خداوندی کے تقاضے پورے نہیں کر رہی ہے تو اس کی اطاعت فرض نہیں رہتی۔ حضورؐ کا ارشاد گرامی قدر ہے کہ جس بستی میں ایک آدمی بھی بھوکا سو جائے اور ساری رات اسے کھانا نہ ملے' اور وہ بستی اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت کا تقاضہ پورا نہیں کر رہی ہے' تو اس بستی سے اللہ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے' اور اس مملکت کی اطاعت اس کے شہریوں سے مرفوع ہو جاتی ہے۔

مضمون کے آخر میں جناب اعجاز ذکاء سیّد صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اس قرآنی Vision پر ضرور غور فرمائیں اور اگر کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اس ادارہ کو اس سے مطلع فرمائیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن کریم کی خدمت کی توفیق عنایت فرمائے۔

☆.....☆.....☆

Metrimonial

We are looking for an educated, family girl, from Quran orientated family, Pakistan or UK, or rest of world for our respectful and obedient 26 year old son, 6 feet 2 inch, very fair, holder of a Pharmacy degree. Education now finished and who lives with family in Birmingham, England, UK.

Also looking for husband for our 27 year old niece, fair, 5 feet 10, Pharmacy degree holder, with above criterion.

Email: jawaidahmad0@yahoo.co.uk

سانحۂ ارتحال

نہایت دُکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ راجہ عبدالعزیز صاحب آف دِھیرکوٹ' آزاد کشمیر' گذشتہ ماہ وفات پاگئے ہیں۔ کچھ عرصہ سے صاحبِ فراش تھے۔ کافی عرصہ سے ماہنامہ طلوعِ اسلام میں جدید سائنسی موضوعات اور قرآن کے موضوع پر خرد افروز مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ جسے قارئین میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان اور لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ ادارہ مرحوم کے خاندان اور اعزہ واقربا کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

ذیل میں ڈاکٹر عبدالرؤف خان صاحب کا ایک مختصر سا مضمون درج کیا جارہا ہے جو محترم راجہ عبدالعزیز صاحب کے حالات سے مختصراً آگاہ کرتا ہے۔ (ادارہ)

آہ! وہ علم کا آفتاب تھا جو ڈوب گیا

ڈاکٹر عبدالرؤف خان

راجہ عبدالعزیز خان سوموار 8 رمضان المبارک 2014ء کو دارالبقاء کی طرف کوچ کر گئے۔ انا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون ایک عرصے سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے مگر ساتھ ساتھ علم وتحقیق کی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ چند ماہ پہلے ایک روٹین چیک اپ کے دوران انکشاف ہوا کہ مثانے میں ایک ٹیومر بن گیا ہے۔ جس کے علاج کے لئے سرجری کی ضرورت ہے۔ مگر کمزوری دل کے باعث Anasthesia جو سرجری کے لئے ضروری ہے' کو برداشت کرنا محال ہے۔ مگر چونکہ سرجری ہی اس کا حل ہے لہٰذا فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر عظمت ہمایوں سنبل صاحب جو پولی کلینک ہسپتال اسلام آباد کے Anasthesialogist ہیں' سے رجوع کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے اس کا انتظام ہوگیا اور PIMS ہسپتال اسلام آباد میں ڈاکٹر نعیم صاحب یورولوجسٹ نے کامیابی سے سرجری کے ذریعے ٹیومر نکال دیا۔ اور یہ مرحلہ Uneventfully گزر گیا۔ البتہ اگلے دن قے اور دست سے بلڈ پریشر گر گیا اور ہلکا سا فالج کا Attack بھی ہوگیا۔ مگر بروقت میڈیکل ایڈز ملنے پر بغیر کسی بڑے نقصان کے صحت یاب ہوگئے اور سی ٹی سکین پر کلیئرنس کے بعد

ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے۔ گھر میں واپسی پر کچھ دن بعد پھر مثانے میں سوزش ہو گئی جس کی وجہ سے بخار اور کمزوری ہو گئی تو بیٹے کیپٹن جمیل اور بھتیجے راجہ خالد یونس نے اُن کو اے ایف آئی یو راولپنڈی میں Hospitalized کروایا۔ جہاں سے تقریباً ایک ہفتہ تک علاج معالجے کے بعد صحت مند قرار دے کر واپس گھر بھیج دیا گیا۔ مگر گھر پہنچ کر دل کا دورہ پڑا جو جاں لیوا ثابت ہوا۔ اُس وقت آپ کی عمر تقریباً 75 برس تھی۔

راجہ عبدالعزیز صاحب ایک مایہ ناز مفکر، محقق اور انشا پرداز تھے آپ کو قرآن فہمی میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ تاریخ، سیاسیات، فلسفہ، سائنس، عمرانیات اور نفسیات پر بھی مُعتد بہ حد تک عبور حاصل تھا۔ اور ان دنوں قرآن مجید اور معاصر علوم میں تطابق میں مشغول تھے۔ اس سلسلے کے کئی مضامین طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ اب تک شائع ہو رہے ہیں۔ مختصراً! اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کہ ''قرآن مجید عقل والوں کے لئے بھیجا گیا ہے'' کی عملی تعبیر تھے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین

☆.....☆.....☆

ضرورتِ رشتہ

ایک بیٹی جس کی عمر 27 سال تعلیم بی کام کے لئے مناسب و موزوں رشتہ کی ضرورت ہے۔ خواہش مند درج ذیل نمبر پر رابطہ فرما سکتے ہیں۔

Mobile: 0321-4593353

ایک نکتہ

بنجر پاکستان میں باغبانی، جنگل کاری اور آباد کاری کے لئے تمام بے کار افرادی قوت کا صحیح استعمال ہی ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی ہے جو یہ حل کر دے!

(باغبان ایسوسی ایشن)

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

آخری قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

انسانی راہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے جو اصول' اقدار اور قوانین بذریعہ انبیاءؑ ملے ہیں انہیں الدّین کہا گیا ہے۔ اور یہ مطلق ہوتے ہیں۔ یہ نہ اضافی ہوتے ہیں اور نہ قابل تغیر۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ ''تمہارے لئے بھی دین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم نوحؑ' ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ اسی دین کو ہمیشہ قائم رکھنا' اس میں کوئی تفرقہ اور اختلاف پیدا نہ کرنا 42:13۔ یہ بنیادی دین تو ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے' البتہ اس پر عمل پیرا ہونے کے طریقوں میں انسانی ضروریات کے مطابق انبیاءؑ کے ذریعے تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ اب نبوت کی تکمیل کے بعد قرآن مجید ہی قیامت تک انسانی ہدایت و راہنمائی کا سرچشمہ رہے گا۔ اس کے اصول و قوانین غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن انسانی زندگی کے اِرتقائی مراحل کی بدلتی ہوئی ضروریات و تقاضات کے مطابق ہر زمانے میں اسلامی نظامِ مملکت قرآنی اصولوں اور اسوۂ حسنہؐ کے تحت اور باہمی مشورے سے جزئی قوانین وضع کرے گا۔ یہ جزئی قوانین قابل تغیر ہوں گے۔ اس طرح ''ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے حسین امتزاج سے کاروان انسانیت' شاداں و فرحاں اپنی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے''۔ (مطالب الفرقان I) اس طریقہ کار میں البتہ اس بات کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے کہ ان جزئی قوانین کے اختلافات کو بطور دلیل پیش کر کے اصل دین کی بابت جھگڑا شروع کر دیا جائے 22:67' 5:48۔

اخلاق و اقدار کے قرآنی موقف کو قدرے تفصیل سے پیش کرنے کا ایک مقصد تو اس حقیقت کو اجاگر کرنا تھا کہ قرآن کا بنیادی اصولِ اخلاقیت (اخلاقی قانون) خودمختار اور کلیۃً حجت ہے۔ ''یہ صرف میرے یا آپ کے لئے نہیں اور یہ اس لئے کہ یہ مشروط قانون نہیں' کسی ایسے مقصد یا غرض کے لئے نہیں جسے میں چاہوں تو اختیار کروں اور نہ چاہوں تو نہ کروں۔ اس قاعدے کو اپنے عمل کا اصول بنایئے جس کے بارے میں آپ دیانتداری سے یہ آرزو کر سکیں کہ تمام عاقلوں کے عمل کا عالمگیر قانون بن جائے (قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل۔ از ڈاکٹر برہان احمد) اخلاقی اقدار چونکہ خود مطلقاً حجت ہیں' بالذات خیر ہیں مقصود بالخیر نہیں' غیر متبدل ہیں' ان کی حیثیت اضافی نہیں اور قانونِ مطلق ہیں اس لئے یہ خالق حقیقی کی طرف سے معروضی حیثیت میں ملتی ہیں۔ یہ موضوعی نہیں کیونکہ کوئی شخص یا سارے انسان بھی مل کر انہیں وضع نہیں کر سکتے۔ یہ حتمی ہیں اس لئے ان کی ماہیت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان کی خلاف ورزی سے انسان ہر پہلو سے نقصان میں رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اقدار محض نظریاتی نہیں ہو سکتیں' بلکہ جب تک کوئی نظریہ یا

عقیدہ عمل میں تبدیل نہ ہو جائے یا عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کسی فرد کی شخصی اقدار کے ضمن میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ تو ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ انسانی میلان طبع، رجحانات، رویے، جذبات، احساسات وعادات، سوچ وفکر اور دیگر انسانی محرکات اور اخلاقیات کا باہمی تعلق کیا ہے اور کیسا ہے۔ یہاں پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان، خصوصاً دانشور، فلاسفہ، سائنسدان اور ماہرین نفسیات، اخلاقیات کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اخلاقی اقدار کو موضوعی یا اضافی سمجھنے یا ان کی نفی یا جھٹلانے والوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اب مختصر سا ذکر اُن سکالروں کا بھی ہو جائے جو سماجی اور تمدنی زندگی میں مطلق اور ہمہ گیر (Universal) اصول واقدار ضروری سمجھتے ہیں۔

نفسیات کا علم جہاں ایک واحد فرد کے ذہنی وکرداری اعمال، حافظہ، سوچ، آموزش، عصبی نظام، دماغ، ذہانت اور دیگر محرکات کے بارے میں تجزیات وتجربات کرتا ہے وہاں وہ انسانوں کے باہمی معاملات میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے اسے معاشرتی یا عمومی نفسیات کہا جاتا ہے۔ نفسیات کی طرح اخلاقیات کا تعلق بھی معاشرتی معاملات سے ہوتا ہے اس لئے ان کا آپس میں گہرا تعلق اور رابطہ ہوتا ہے۔ ابتداء میں چند نفسیاتی بیماریوں کا ذکر ہوا تھا۔ ان بیماریوں کا اخلاقیات سے کس قدر گہرا رشتہ ہوتا ہے اسے علمائے نفسیات نے اپنی تحقیقات میں شامل کر کے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً نوفرائڈی فلسفے کے بانیوں میں ایرک فرام (Erich Fromm) کا نام مشہور ہے۔ اس کے بارے میں آگے چل کر بھی بات ہوگی، یہاں نفسیاتی عوارض اور اخلاقیات کے باہمی تعلق پر اس کا تجزیہ دیکھئے۔ وہ لکھتے ہیں ''نفسیاتی صحت اور نفسیاتی عوارض کا مسئلہ اخلاقیات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نفسیاتی عارضہ کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کا مظہر ہے'' ''ہیومن ازم'' کے ضابطۂ اخلاق کی رُو سے، انسانی ذات کی تکمیل وتحکمیت میں ناکامی، بجائے خویش اخلاقی ناکامی ہے۔ اس سے بھی زیادہ متعین الفاظ میں، نفسیاتی عوارض کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کے مظاہر ہوتے ہیں اور نفسیاتی علامات، اخلاقی کشمکش کے حل نہ کرنے کا نتیجہ (Man for him self)۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ یہ ماہر نفسیات ہیومینیٹیرین ہے وحی کا قائل نہیں۔ اس کے باوجود یہ ماہرین نفسیات میں پہلا شخص ہے جس نے انسان اور کائنات کے بنیادی رشتے کا سوال اٹھایا ہے۔

مغربی مفکرین اور علمائے نفسیات نے اخلاقیات پر بہت کام کیا ہے ان میں 'R.A.P.Rogers' نے تاریخ اخلاقیات کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قدیم یونانی فلاسفہ سے لے کر موجودہ دور کے جدید فلسفیوں تک، اکثر مشہور مفکرین کے اخلاقیات کے بارے میں نظریات بیان کئے گئے ہیں۔ راجرز نے اخلاقیات سے متعلقہ کچھ سوالات ابتداء ہی میں اٹھائے ہیں اور کہا ہے کہ اخلاقیات ان سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ (1) کیا مسرت عمل کی انتہائی غایت ہے۔ (2) کیا نیکی لذت کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔ (3) لذت ومسرت میں فرق کیا ہے۔ (4) اس کے کیا معنی ہیں کہ مجھے فلاں کام کرنا چاہئے یا فلاں اصول مثلاً ایفائے عہد وغیرہ کا احترام کرنا چاہئے۔ (5) کیا مجھ پر کوئی ایسی ذمہ داری ہے کہ میں دیگر افراد کے لئے بھی کوشش کروں اور اپنی غایت کے لئے بھی اگر ایسا ہے تو ان دونوں غایتوں کا صحیح تناسب کیا ہے۔ (7) اختیار وارادہ کے کیا معنی ہیں۔ (8) احساس وعقل میں سے کردار کا صحیح راہبر کون ہے (9) خیر، ثواب، فریضہ اور ذمہ داری کے نظری اور عملی طور پر کیا معنی ہیں؟ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اخلاقیات کے بارے میں جتنے بھی ممکن سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں، راجرز کے اٹھائے گئے سوالات میں اصولی طور پر موجود ہیں۔ اس کے نزدیک

اخلاقیات اس امر کو فرض کرتی ہے کہ اچھی اور بری غایتوں میں فی الحقیقت ایک امتیاز ہے۔ نیز یہ کہ اخلاقیات وہ علم ہے جو ان اصولوں کو دریافت کرتا ہے جن سے کردار انسانی کے اصلی غایات کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہو۔ راجرز نے تاریخ کے مشہور فلاسفہ اور حکماء کے حوالوں سے اپنے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔

مثلاً سوفسطایہ اور پروٹاغورس وغیرہ کا کہنا ہے کہ خیر و شر کا معیار انسان خود ہے۔ لیکن سقراط اور افلاطون وغیرہ نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے۔ ''سقراط یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ فضیلت اور فلاح انسانی غیر متغیر قوانین کے تابع ہے جو افراد کی ڈاواں ڈول پسند پر مبنی نہیں ہوتے۔ نیز یہ کہ ان قوانین کا انکشاف بھی ہوسکتا ہے اور ان کی ہم دوسروں کو تعلیم بھی دے سکتے ہیں''۔ سقراطی مذہب کے دو فرقے سرینیہ اور کلبیہ ہیں۔ سرینیہ کے بانی ارتس پس کے نزدیک لذت ہی مقصدِ حیات ہے یعنی لذت بخش احساسات ہی سعادت کا بڑا عنصر ہیں۔ جبکہ کلبیہ کے بانی انٹی ستھینز عمل اور ضبط و تحمل پر زور دیتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ سب سے بڑی غایت یہ ہے کہ انسان فضیلت کے مطابق زندگی بسر کرے۔ سقراط کا دعویٰ تھا کہ اخلاقی فضیلت ایک طرح کا علم ہے۔ (نیکی علم ہے)۔ پلاٹو کے نزدیک عدالت روح کی فضیلت ہے۔ یہ اسی طرح روحانی حسن و تندرستی کا نام ہے جیسے کہ بدی روحانی قبیح اور بیماری کا نام ہے۔ اس کے مطابق عدالت کا اصلی جوہر داخلی و روحانی ہے۔ اس لئے افراد کی سیرت میں اس کا پایا جانا لازمی ہے۔ نیز یہ کہ خیر مطلق عقل کے ذریعے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن اس کی نوعیت تمثیلاً ہی بیان کی جاسکتی ہے۔ (قرآن پاک کے مطابق یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ اس کی کوئی مثال ہی نہیں 42:11)۔ ارسطو کے نزدیک جو افعال اخلاقی نقطہ نگاہ سے معمولاً اچھے ہوں وہ تسویقاً نہیں بلکہ عمداً ہوتے ہیں۔ اپیقورس نے سرینیہ کی اخلاقیات کو ایک مہذب اور اصلاح شدہ شکل میں پیش کیا۔ کلبیہ کا خیال تھا کہ فضیلت برترین خیر ہے اس کا حصول ہی مسرت اور سعادت کے مساوی ہے۔ رواقیہ نے اس نظریے کو ترقی بھی دی اور اصلاح بھی کی۔ زینو قبرصی اس فلسفہ فکر کا بانی تھا۔ نوافلاطونیت کے حکماء نے افلاطونی فلسفہ اور عبرانیوں کی اخلاقیات کو مخلوط کر کے ایک نئے مذہب کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ آگسٹائن کی تعلیم تھی برترین خیر محبتِ الٰہی ہے۔

تھامس ہابز موجودہ غیر مذہبی اخلاقیات کا بانی ہے۔ اس کی طبعیات' نفسیات اور اخلاقیات یونانی فکر کی آزاد و بے غرضانہ خصوصیت رکھتی ہیں۔ یہ ہابز ہی تھا جس نے واضح اور عام اعلان کیا کہ انسان کے لئے اپنی خیر کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی خیر کے لئے سعی وجد و جہد کے واسطے کوئی محرک ہو ہی نہیں سکتا۔ اہل فطرت کے نزدیک اخلاقی تصورات ماخوذ نہیں یہ ایسی خواہشوں' احساسات یا جبلیات کے نتائج ہوتے ہیں جو کوئی اخلاقی مفہوم نہیں رکھتیں یہ قوانین میکانکی ہیں عقل ان کی راہنمائی نہیں کرتی۔ ہابز ان قوانین کو بقائے نفس اور اثبات نفس کی فطری جبلتوں سے اخذ کرتا ہے۔ ہیوم ان قوانین کو مختلف احساسات سے اخذ کرتا ہے اور ہربرٹ سپنسر اخلاقی تصورات اور اخلاقی ذمہ داری کو موروثی جبلتوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔ یہ اہل فطرت کا نظریہ ہے۔ اس کے برعکس اہل وجدانیہ یہ کہتے ہیں کہ اخلاقی ذمہ داری' اخلاقی تصورات اور حقائقِ انسانی ناقابل تحلیل ہوتے ہیں۔ ان کی توجیہہ اس طرح نہیں ہوسکتی کہ یہ غیر اخلاقی قوتوں مثلاً ذاتی غرض' حیوانی جبلتوں یا محبت و لذت کے نتائج ہیں۔ وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ جزوی افعال کی اخلاقیت یعنی اخلاق کے اساسی اصول وجدانی طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہ اخلاق سے ابدی حقائق کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اس نظریے کی تردید کرتے تھے کہ

اخلاقی روایات محض باہمی معاہدات اور پیمانوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ اس نظریے کو حقائق کے خلاف سمجھتے تھے۔ راجرز کے مطابق 19ویں اور 20ویں صدی میں اس تفریق کی شدت ختم ہوگئی ہے۔ اب ارتقائی مظہریت اور عقلی تصوریت کے درمیان مقابلہ ہے۔ نیز اب اس میں افادیت کا نظریہ بھی شامل ہوگیا ہے۔ یعنی بڑی سے بڑی تعداد کی زیادہ سے زیادہ مسرت۔ کانٹ کے نزدیک اخلاق کا تمام تر دارومدار انسان کے صاحب اختیار ہونے پر ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کے کوئی معنی ہی نہیں ہوں گے۔ ہابز کی طرح بتیتھم بھی کہتا ہے کہ انسان صرف اپنی لذت و مسرت کے لئے کوشش کرسکتا ہے۔ یعنی سعی اور جدوجہد کے لئے انسان کے پاس اور کوئی قوتِ محرکہ ہے ہی نہیں۔

تھامس ہابز م 1679ء مادیت پسند ہونے کے باعث قدر و اختیار کا منکر ہے اور جبر مطلق کا قائل ہے۔ اس کے پیش کردہ ''سوشل کنٹریکٹ'' یا معاہدہ عمرانی میں یہی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نے انسانی فعل اور اختیار میں عجیب اور منفرد فرق ظاہر کیا ہے۔ اس کے خیال میں انسان جس بات کا ارادہ کرتا ہے' اس پر عمل کرنے میں وہ آزاد ہے۔ لیکن ارادہ کرنے میں وہ مجبور ہے۔ بہرحال ہابز اور اس کے ہمنواؤں کا یہ کہنا کہ اپنی مسرت کے علاوہ اور کوئی انسانی جذبہ محرکہ ہے ہی نہیں' عقائد کی دنیا میں بڑی اہمیت کا حامل نظریہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جدید عقائد مثلاً انسان دوستی (Humanitarianism) یا سیکولرازم وغیرہ کا یہ دعویٰ باطل ہوجاتا ہے کہ یہ مذاہب انسان کی بھلائی' اس کے مفاد اور اس کی فلاح و بہبودی کے لئے کوشاں ہیں۔ جبکہ اس نظریے کے مطابق یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنی خوشی کے عوض دوسروں کی خوشی کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالی جائے۔ ان نئے مذاہب کے مطابق چونکہ انسانی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے۔ انسانی ذات یا حیات بعد الممات کے یہ لوگ قائل ہی نہیں۔ اس لئے انسانی ہمدردی' انسانیت کے تقاضے' انسانی مفاد' انسانی بھلائی' انسانی ذمہ داری' انسانی جذبات و خواہشات بلکہ خود احترامِ انسانیت اور انسانیت کی خیر خواہی جیسے عقائد و نظریات پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کے پاس کوئی بنیاد' محرک یا ترغیب (Incentive) ہے ہی نہیں۔ بلکہ مارکسزم کے بانی مارکس کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک انسان اپنی مشقت اور جان توڑ محنت کی کمائی دوسروں کی مسرت و بھلائی کے لئے کیوں دے تو اس کے پاس بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ اس کا تشفی بخش حل تو صرف وحی خداوندی کے پاس ہے اور یہ لوگ وحی کے منکر ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری پر بحث کے دوران اکثر یہ اہم سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ کیا انسان پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی بھی ہے جس کے تحت وہ اپنی طمانیت و سعادت کی بجائے خارجی خیر کی تلاش و جستجو کرتا پھرے۔ یہ سوال اس طرح بھی ہے کہ میں ایسی خیر کی تلاش کیونکر کرسکتا ہوں جس کا تمام و کمال مجھ کو تجربہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے شخص کی خیر کا تجربہ اس کو ہوگا نہ کہ مجھ کو۔ اس لئے میرے عمل کے لئے تو اس کی خیر ایک ثانوی اور اکتسابی محرک ہوگی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا' اس بارے میں فلاسفہ متفق نہیں۔ مادئین اس قسم کی کسی ذمہ داری کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ناممکن سمجھتے ہیں۔ جبکہ مشابہت پسند اسے تسلیم کرتے ہیں۔

گذشتہ قسط میں مادئین کا ذکر ہوا تھا جو اخلاقی اقدار کو موضوعی اور اضافی سمجھتے ہیں۔ ان کے برعکس ایسے فلسفی اور سائنسدان بھی ہیں جو ان اقدار کو مطلق اور ہمہ گیر سمجھتے ہیں۔ جن میں چند فلسفیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک خیر و شر کی اپنی اپنی ناقابل تغیر خصوصیات ہوتی ہیں۔ مشہور فلسفی ریلف کڈورتھ جو آکسفورڈ میں افلاطونی فلسفے کا شارح تھا۔ وہ اس امر کا مدعی تھا کہ خیر و شر کی مقررہ نوعتیں ہوتی ہیں اور ان کا انحصار کسی رائے یا معاہدے پر نہیں ہوتا۔ پس اخلاقی امتیازات کا تصفیہ کسی انسان کی قوت یا ارادے سے نہیں

ہوسکتا۔ارادہ کسی شر کو خیر اور خیر کو شر اسی طرح نہیں کرسکتا جس طرح سیاہ کو سفید نہیں کیا جاسکتا۔حتیٰ کہ خدا بھی ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اقدار کی معروضی حیثیت کی پروفیسر الفرڈ کوبن نے یوں وضاحت کی ہے۔

"Complete way of life which would be universal is neither present in human instinct, nor can be derived through human intelect. It can only come through revelation." (The crises of civilization).

پروفیسر راشڈل بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔''اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہو جو ہر انسان کے لئے یکساں ہو یہ اقدار مستقل اور عالمگیر ہوں۔ہر شخص فیصلہ نہ کرے کہ مستقبل اقدار کیا ہیں۔(The Theory of good and evil)

اقدار کے بارے میں نظریۂ اضافیت کے بانی اور مشہور زمانہ آئن سٹائن کی بات بھی اسی طرح غور طلب ہے جس طرح ان کی مساوات $E=mc^2$ ہے۔وہ کہتے ہیں''ہمیں تنہا عقل کو خدا نہیں بنانا چاہئے۔عقل ذرائع اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے۔لیکن مقاصد اور اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہو جاتی ہے۔سائنس مطلق اقدار متعین نہیں کرسکتی اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کرسکتی ہے۔یہ اقدار تجربات سے وضع نہیں ہوسکتیں بلکہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے ملتی ہیں۔ان کی بنیاد عقل پر نہیں ہوتی لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترتی ہیں۔کیونکہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے ثابت ہو''۔

(out of my later days)۔ڈاکٹر ژنگ کا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ژنگ پر آگے چل کر بات ہوگی۔

دنیائے محسوسات وطبعیات کی وسعت اور عمق کے متعلق ریڈنگ یونیورسٹی کے طبعیاتی ماہر ڈاکٹر جیمس آرنلڈ کروتھر کہتے ہیں۔ ''نظامِ فطرت اپنی گہری سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر' آخری انسان کے لئے ہی چھوڑنا پڑتا ہے''۔(The great design)۔ڈاکٹر جیمز کی یہ بات انسانی نفسیات پر بھی صادق آتی ہے۔جیسا کہ ابتداء میں ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن پاک نے اپنی حقانیت وصداقت کے ثبوت میں عالم آفاق (خارجی کائنات) اور عالم انفس (انسان کی داخلی دنیا) کو پیش کیا ہے 41:53۔خارجی کائنات پر غور وتدبر' اس کے نظم وضبط اور قوانین کے متعلق سائنسی تحقیقات وتجربات انسانی تاریخ میں کافی عرصے سے جاری ہیں اور ان میں ہمارے دور تک کافی ترقی ہو چکی ہے۔لیکن انسانی نفسیات کے متعلق تحقیق کا سلسلہ ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے اس لئے اس تحقیق نے ابھی تک باقاعدہ سائنسی مسلمہ کی حیثیت حاصل نہیں کی۔تاہم کچھ ماہرین اب نفسیاتی علم کو سائنسی درجہ دے رہے ہیں۔اس علم کو بنیادی طور پر علم النفس یا سائیکالوجی (Psychology) کا نام دیا گیا ہے۔سائیکالوجی یونانی زبان کے دو الفاظ 'Psyche' اور 'Logos' کا مرکب ہے۔لفظ 'Psyche' یونانی لفظ 'Psukhe' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب سانس یا روح ہے۔'Logos' کا مطلب لفظ' کلام یا منطق ہے۔لفظ لوگس (Logos) کی نفسیات سے ہٹ کر بھی اپنی ایک طویل تاریخ ہے۔ارسطو سے بھی پہلے یونانی فلسفی ہرقلیتس نے اس لفظ کو پہلی بار عقل کے مفہوم میں استعمال کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہمہ گیر حرکت وہیجان بن کر کائنات میں سرایت کئے ہوئے ہے۔اناکساغورس نے اس واسطے کو عقل اول کا نام دیا تھا۔اس لفظ کو سب سے زیادہ فلو یہودی نے استعمال کیا۔اسے علم کلام کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے۔یونانیوں کی اکثریت اس بات کی قائل تھی کہ کوئی چیز عدم سے

وجود میں نہیں آ سکتی۔ اس لئے فلو نے لوگوس کا سہارا لے کر تکوین کائنات کے ذکر میں کہا کہ لوگس خدا اور کائنات کے درمیان وہ ضروری واسطہ ہے جس کے بغیر کائنات کی تخلیق ممکن نہیں تھی۔

بہرحال ماہرین نفسیات نے لوگس کے لفظ کو نفسیات سے ہی منسلک کیا ہے۔ قدیم زمانے میں چونکہ تمام علوم کو منطق قرار دیا جاتا تھا اس لئے سائیکالوجی سے مراد ''علم روح'' لیا گیا۔ ماہرین کے مطابق اس علم کا ذکر پہلی بار ارسطو نے اپنی کتاب 'De Anima' میں کیا ہے۔ لیکن سائنسی حلقوں میں لفظ 'Psychology' کا استعمال دسویں صدی عیسوی کی یورپی کتابوں میں کیا گیا۔ انگریزی زبان میں لفظ سائیکالوجی 1693ء میں پہلی بار استعمال ہوا۔ لفظ سائیکالوجسٹ 1727ء اور سائیکالوجیکل 1776ء میں۔ 19ویں صدی کے وسط تک یہ الفاظ یورپی ممالک میں عام ہو چکے تھے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند میں انگریزی علوم کے زیر اثر یہ الفاظ صرف پڑھے لکھے افراد تک محدود رہے۔ قدیم دور میں نفسیات سے مراد علم روح تھا' لیکن یورپ کے جاگیردارانہ ماحول میں روح کے تصور نے ایک مذہبی رنگ اختیار کر لیا جو کہ علمی تقاضوں پر پورا نہیں اترتا تھا چنانچہ روح کی جگہ ذہن نے لے لی۔ مگر یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور سائنس کا دور شروع ہونے کے بعد ذہن کے تصور کو بھی غیر سائنسی قرار دے دیا گیا کیونکہ روح کی طرح ذہن کا بھی مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر انسان کے ذہنی اعمال کا سائنسی طریقوں سے مطالعہ کیا جانے لگا اور اسے علم شعور قرار دیا گیا۔ بیسویں صدی میں شعور کے تصور کو بھی غیر سائنسی قرار دے دیا گیا کیونکہ اس کا بھی براہِ راست مطالعہ ممکن نہیں تھا۔ اب نفسیات کی تعریف قابل مشاہدہ کردار کے حوالے سے کی گئی یعنی کردار کا سائنسی مطالعہ۔ یہ تعریف امریکی ماہر نفسیات واٹسن نے کی تھی۔ لیکن یہ تعریف خاصی انتہا پسند تھی کیونکہ اس میں ذہن اور شعور جیسے بنیادی موضوعات کو نفسیات سے خارج کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے نفسیات کی وہ انفرادیت ختم کر دی گئی تھی جو اسے دوسرے معاشرتی سائنسز سے علیحدہ کرتی تھی۔ نیز ذہن اور شعور جیسے اہم موضوعات کا مطالعہ کئے بغیر کسی فرد کا مکمل تجزیہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے ماہرین نے ایسی تعریفوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اب نفسیات کو انسانی اعمال و افعال کے سائنسی مطالعے کا نام دیا جاتا ہے۔

نفسیات ایک علم مطالعہ (Discipline) کا نام ہے جس کے اپنے اصول و ضوابط اور طریقہ ہائے کار ہیں۔ دیگر معاشرتی سائنسز کی طرح نفسیات کی تعریف میں بھی ماہرین کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ چند اختلافات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لفظ "Psyche" کا مطلب ذہن بھی ہوتا ہے اس لئے بہت سے ماہرین اسی نسبت سے نفسیات کم علم الذہن قرار دیتے ہیں۔ سب سے پہلے افلاطون (347-427 ق م) نے ذہن (Mind) کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ بعد میں لاک' ولیہم' ہابز اور ٹچز وغیرہ نے نفسیات کو ذہنی اعمال (Mental Processes) کا نام دیا۔ ان کے نزدیک نفس صرف نفسی واراتوں کا مجموعہ ہے۔ اب پھر نفسیات کو علم روح بھی کہا جانے لگا ہے۔ اسے سائنسی معنوں میں سب سے پہلے کریٹس وول نے اٹھارویں صدی میں استعمال کیا تھا۔ امریکی ماہر نفسیات اور مفکر ولیم جیمس کے نزدیک ''نفسیات وہ علم ہے جو شعور اور شعوری اعمال کا مطالعہ کرے''۔ ایک اور امریکی مفکر جان ڈیوی لکھتا ہے ''نفسیات کو فرد کے ان ذہنی تجربات کی اقدار کا مطالعہ کرنا چاہئے جن کے مطابق فرد اپنے آپ کو ماحول کے تحت ڈھال لیتا ہے''۔ 'J.P.Watsan' نے نفسیات کو خالص سائنس کا درجہ دینے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''یا تو میں نفسیات کو ایک خالص معروضی سائنس بنا دوں گا یا اسے چھوڑ دوں گا۔ اس کے نزدیک:

"Psychology is the scientific study of experience and behaviour, human and animal, normal and abnormal, individual and social."

یعنی نفسیات سے مراد باقاعدہ اور سلسلہ وار تجربات اور کردار کا مطالعہ ہے۔ خواہ وہ انسانی ہو یا حیوانی، طبیعی ہو یا غیر طبیعی، انفرادی ہو یا اجتماعی اور کردار سے مراد نامیات کی ایسی سرگرمیاں لی جاتی ہیں جن کا مشاہدہ دوسرا شخص یا تجربہ کار کر سکتا ہو"۔ اس تعریف کو کرداری، معروضی، سائنٹفک اور تجرباتی کہا جاتا ہے۔ ولیم لیک ڈوگل نفسیات کو معروضی اور موضوعی (باطنی مشاہدہ) دونوں سمجھتا ہے۔

چند ماہرین نفسیات نے نفسیات کی اس طریقے سے تعریف کرنے کی کوشش کی ہے جو سائنسی ہو، نفسیات کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھے، اس کے وسیع اور پھیلے ہوئے موضوعات کو اپنے اندر سمو سکے اور مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والے ماہرین نفسیات کو قابل قبول ہو۔ مثلاً روسی ماہر نفسیات روبن سٹائن کے مطابق "نفسیات وہ سائنس ہے جو کہ انسان کے دماغ کی سرگرمیوں کے قوانین کا انکشاف کرے"۔ امریکی ماہرین نفسیات 'Kagan' اور 'Havemann' نے نفسیات کی یوں تعریف کی ہے۔ "نفسیات وہ سائنس ہے جو قابل مشاہدہ کردار اور اس کردار کے عضویہ کے باطنی ذہنی عوامل اور ماحول کے بیرونی واقعات کے ساتھ تعلقات کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کی تشریح بھی کرتی ہے۔ اس تعریف کو جامع سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ تعریف انسانی اور حیوانی کردار دونوں کے مطالعہ کو اپنے دائرہ کار میں لے آتی ہے۔ کردار کے علاوہ ذہنی عوامل کے مطالعہ کو نفسیات کا لازمی جزو سمجھتی ہے اور اس کے مطابق ذہنی عوامل کا بھی سائنسی مطالعہ ممکن ہے۔ ان کے علاوہ بھی نفسیات کی بہت تعریفیں کی گئی ہیں لیکن نفسیات کا مضمون اتنا وسیع ہے کہ اس کی تمام خصوصیات کو کسی ایک تعریف میں سمو دینا ناممکن ہے۔ آسانی کے لئے بس یہ سمجھ لیں کہ ہر تعریف میں اس کا کوئی نہ کوئی پہلو شامل ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے ہاں بھی معمولی پڑھے لکھے افراد میں نفسیات کا لفظ روزمرہ زبان کا حصہ بن چکا ہے۔ جس طرح والدین اور اساتذہ کو بچوں سے نفسیاتی طریقوں سے نبٹنا پڑتا ہے۔ یا پیر اپنے مریدوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں یا ایک اچھا سیاستداں عوام کی نفسیات سمجھتا ہے۔ ماہر نفسیات بھی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ یہاں جو نفسیات کا تصور ابھرتا ہے، وہ علم غیب کا تصور ہے۔ اکثر لوگوں کی طرح یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماہر نفسیات بھی کسی، پیر، نجومی یا دست شناس کی طرح لوگوں کے چہرے، ہاتھ یا ستارے دیکھ کر ان کی نفسیاتی یعنی ان کی شخصیت اور دل کا حال جان لیتا ہے۔ نفسیات کی زبان میں ایسے تصورات کو سٹیریوٹائپ (Stereotype) کہتے ہیں۔ اس سے مراد کسی فرد یا گروہ سے ایسے خیالات یا خصوصیات منسوب کرنا جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایک ماہر نفسیات کا طریقہ کار ایک باقاعدہ منظم علم کے تحت ہوتا ہے۔ دراصل ماہر نفسیات کئی ایسے کام کرتا ہے جو ان پیشوں سے متعلقہ افراد کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کی شخصیت کی خصوصیات معلوم کرنا، اس کی خامیوں اور خوبیوں کی نشاندہی کرنا، فرد کی پریشانیاں اور الجھنیں دور کرنا، فرد کو کاروبار، ازدواجی زندگی، جنسی معاملات اور مستقبل کے حالات وغیرہ کے بارے میں مشورے دینا وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے ماہر نفسیات کو ان پیشوں سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ یہ پیشے صدیوں سال پرانے ہیں لیکن ان کی کوئی سائنسی حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی کیونکہ یہ علوم سائنسی تحقیق کی بجائے ذاتی تصورات اور قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں نفسیات کا علم نیا ہے لیکن اب اسے ایک سائنس کی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ ماہرین نفسیات معلومات اکٹھی کرنے کے لئے وہی طریقے استعمال

کرتے ہیں جو سائنسدان کرتے ہیں۔ یعنی مفروضے قائم کرنا' ان کی جانچ پڑتال کے لئے مشاہدہ کرنا' تجربات کرنا' مفروضات کو تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں پرکھنا وغیرہ۔ یہ خیال بھی درست نہیں کہ نفسیات کے پڑھنے سے ذاتی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر برہان احمد کہتے ہیں کہ دیگر علوم کی طرح سائیکالوجی کی سائنس بھی پہلے فلسفے کا جزو تھی لیکن علوم کی نشوونما کی وجہ سے یہ علوم فلسفے سے الگ کر دیئے گئے۔ انہوں نے ہر علم (Science) کے لئے چند شرائط ضروری قرار دیئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی شرط ہے کہ ''ہر سائنس کے لئے تین وظیفے ادا کرنے ضروری ہیں یعنی مشاہدہ (Observation) گروہ بندی (Classification) اور توجیہ (Explantion) توجیہ کے لئے ہر سائنس کے کچھ اپنے مقولات (Categories) یعنی بنیادی تصورات ہونے چاہئیں''۔ انہوں نے طبعیات' حیاتیات اور نفسیات کے مقولات کی تفصیل بھی دی ہے۔ مثلاً نفسیات کے مقولات یہ ہیں۔ انا یا خودی (Ego) شعور (Consciousness)' ادراک (Knowing)' جذبہ' ارادہ (Willing)' مقصود (Purpose)' ذریعہ (Means) وغیرہ وغیرہ۔ ماہر نفسیات رفیق جعفر کے نزدیک مختلف سائنسی علوم کے مقاصد اس لحاظ سے مشترک ہیں کہ وہ سب کسی عمل کو سمجھنے یا اس کی وجوہات تلاش کرنے' پیائش کرنے' نوعیت بیان کرنے' پیش گوئی کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفسیات کے بھی یہی مقاصد ہیں یعنی کردار اور ذہنی کیفیات کو' پیائش کرنا' ان کی نوعیت بیان کرنا' کردار اور ذہنی کیفیات کو سمجھنا اور ان کی وجوہات تلاش کرنا' کردار اور ذہنی کیفیات کی پیش گوئی کرنا اور انہیں کنٹرول کرنا وغیرہ۔

ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں ''نفسیات ایک نئی سائنس ہے جو قدیم سوالوں کے جوابات تلاش کرتی ہے''۔ یعنی انسان اپنی ذات' لوگوں کے کردار' فرد کے محرکات اور اس قسم کے دیگر مسائل سے دوچار رہا ہے۔ اس لحاظ سے نفسیات ایک قدیم علم ہے۔ جو ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے بے شمار تکالیف اور مشکلات کے باوجود بھی انسان نے اپنی ذات اور دوسرے لوگوں کے کردار کے بارے میں کچھ نفسیاتی نظریات قائم کئے جنہیں نفسیات کی ابتدائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سب سے اہم تصور 'روح' کا ہے۔ قدیم انسان کے خیال میں ہر فرد کے اندر کوئی مادی چیز یا کوئی اور فرد موجود تھا جو مرگی یا بیماری میں اس کے اندر گھس جاتا تھا اور خواب یا موت میں اس کے جسم سے نکل جاتا تھا۔ اس طرح قدیم انسان نے انسانی خون' سانس اور سائے کو روح سمجھا جس کے نکل جانے سے انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تصور روح کے مذہبی تصور سے خاصا مختلف ہے۔ ایک اور عام خیال تھا کہ پاگل پن کے دورے میں جنات' شیطان یا کوئی اور روح جسم میں داخل ہو کر فرد کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اور ان غیبی قوتوں کو نکالنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ کام جادوگر' عامل وغیرہ سرانجام دیتے تھے۔ ان تصورات کی جڑیں انسانی لاشعور میں اتنی گہری ہیں کہ انبیاءؑ نے ان توہم پرستیوں کو انسانی ذہن سے کئی بار نکالا بھی لیکن یہ تصور ابھی تک اکثر لوگوں کے ذہن میں موجود ہے۔ قرآن پاک کی نیر درخشندہ' ضیا تابندہ اور سیرت محمدیہؐ کے جگمگاتے چراغ (سراجاً منیرا) نے دنیا میں عقل و دانش و علم و بصیرت کی روشنی پھیلائی تو دنیا کی کچھ قوموں نے غلط تصورات' معتقدات اور توہمات کے دبیز پردوں کو چاک کر دیا۔ مگر ہم ابھی تک اُسی قدیمی دور میں رہ رہے ہیں۔

☆.....☆.....☆

آصف جلیل

الهداية والعرفان فی تفسير القرآن بالقرآن
محمد ابو زيد الدمنهوری

مندرجہ بالا تفسیر کے ترجمے کی مزید قسط پیش خدمت ہے۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہونے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ادارہ اس سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہے۔

سورة التوبة

(۲) ۵ تک پڑھیں تاکہ معلوم ہو کہ جن چار مہینوں میں جنگ کرنا منع ہے وہ حج کے مہینے ہیں۔ پڑھئے البقرة ۱۸۹ سے ۱۹۷، اور ۲۰۳ اور تدبر کریں کہ جنگ اور حج میں کیا تعلق ہے۔

(۶) یہ لڑنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کی انتہا ہے۔ اس سے یہ مقصد سمجھیں کہ انہیں قائل کیا جائے حتیٰ کہ وہ حق کے متعلق جان لیں اور حملہ کرنے سے باز رہیں۔

(۱۲) (ائمة الكفر) یہ بتایا جا رہا ہے کہ برائی کا اصل سبب یہ امام اور سربراہ ہیں جو امت کو خراب کرتے ہیں تاکہ انہیں اپنی خواہشوں اور مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں۔

(۳۱۔۳۵) الاحبار والرهبان ۔ مذہبی لیڈر ہیں انہیں اللہ کے سوا ساتھی اس طرح بنایا جاتا ہے کہ انہوں نے جو شریعت اور مذہبی احکام بنا رکھے ہیں ان پر عمل کیا جائے اگرچہ اللہ نے ان کا راستہ نہ بتایا ہو۔ ہر زمانے میں ان کی اکثریت نے ایسی رسومات بنا رکھی ہوتی ہیں جنہیں دین سے منسوب کیا جاتا ہے تاکہ ان سے مال کھایا جائے۔ وہ عوام کے سامنے ایک اعلیٰ مقام بنا رکھتے ہیں جسے وہ لوگوں کو حق سے روکنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی امت کے خلاف ہوتے ہیں اور مال اور جاہ وجلال کی لالچ میں اس کے دشمنوں کے مددگار ہوتے ہیں۔ دیکھیں ان پر اللہ کا عذاب کیسے آتا ہے۔

(۸۰) (سبعين مرة) اس سے مراد مخصوص عدد نہیں ہے بلکہ استغفار کی کثرت کے لئے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چاہے ان کے لئے کتنی ہی مغفرت طلب کریں اللہ ان کی مغفرت ہرگز نہیں کرے گا کیونکہ انہوں نے اس کی معصیت کی ہے اور توبہ نہیں کی۔ مغفرت کا تعلق ان کی توبہ سے ہے، آپؐ کے مغفرت طلب کرنے سے نہیں۔ اس میں الرسول کے لئے ہدایت ہے کہ اس طرح کے لوگوں کے لئے مغفرت طلب نہ کریں کیونکہ یہ اللہ کے نظام اور اس کی سنت کے خلاف ہے۔ ۱۱۳۔۱۱۴ تک پڑھئے پھر غافر کے شروع میں جائیے تاکہ ملائکہ کے استغفار کے بارے میں جان لیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے انبیاء اور نیک لوگوں کی سفارش کی امید لگا رکھی

ہے وہ بھی جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے ذریعے تمام امیدوں کا امکان ختم کر دیا ہے جو صلاحیت بخش عمل کئے بغیر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱۲۲) یہ امت کو منظم کرنے کی بنیاد ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں سے الدین سب سے زیادہ مضبوط کرنے والا ہے۔ دیکھئے المزمل کے آخر میں۔

سورۃ یونس

(۵۹۔۶۶) جان لیں کہ اس میں اللہ ان لوگوں کی ملامت کر رہا ہے جو اللہ کے عطا کردہ طیب رزق کو حرام قرار دیتے ہیں اور اسے اس نے کفر کرنا کہا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جو ہر زمانے میں اپنے آپ کو مفتی کے منصب پر فائز کر لیتے ہیں۔ اگر آپ الانعام کی طرف لوٹیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح لوگ تخے اور چڑھاوے ان مرے ہوئے ولیوں کو پیش کرتے ہیں جن کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور کس طرح وہ قربانی کے جانور ان کے نام پر چھوڑ دیتے ہیں اور انہیں کھانا اپنے لئے حرام قرار دے دیتے ہیں۔

(۹۲) (ببدنک) یعنی روح بغیر کے (جسم)۔ اس کی لاش مصر کے عجائب گھر میں محفوظ پڑی ہے۔ اسے دیکھ کر بادشاہوں اور حاکموں کو عبرت حاصل کرنا چاہئے۔

سورۃ ھود

(۲۷) الملأ . بڑے لوگ جو وسائل پر قابض ہوتے ہیں اور اپنے ماتحتوں اور اپنی رعایا کو کم تر سمجھتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اصلاحات سے مساوات ہوتی ہے جس سے ان کی حکمرانی اور بڑائی ختم ہوتی ہے

(۴۵۔۴۷) اس سے ہمیں یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک شخصیات کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ صلاحیت بخش اعمال کی ہے۔ یہ حضرت نوح کا بیٹا ہے جو ابوالانبیاء ہیں لیکن وہ اسے قبول نہیں کرتا کیونکہ اس نے برا کیا۔ دیکھئے التحریم تاکہ حضرت نوح کی بیوی اور دوسروں کے بارے میں معلوم ہو۔

(۸۸) یہ بتایا ہے کہ دیانت دار نصیحت کرنے والے کی نشانی یہ ہے کہ وہ جو کہتا ہے اس پر عمل کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو الحق کی طرف بلائے اور خود اس کے خلاف اور برعکس عمل کرے۔

(۱۰۷۔۱۰۸) (الا ما شاء ربک) اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسی کے ہاتھ میں اپنی سنتوں کا کنٹرول ہے۔ کوئی اور اس کے ساتھ اس کے نظام میں اور نتائج میں کسی طرح حصہ دار نہیں۔ اس کی مشیت اپنی حکمت کے تابع ہے اور اس کی عدالت کے سوا کوئی اور نہیں۔

سورۃ یوسف

(۱۰۰) (وخروا له سجداً) وہ (حضرت یوسف کے والدین) ان کے ماتحت آ گئے اور ان پر بھی احکام لاگو ہو گئے۔

سورۃ الرعد

(۱۰۔۱۳)(وسارب لہ بالنہار لہ معقبات) آپ ظالم اور سخت مزاج حکمرانوں کی ایسی حالت دیکھتے ہیں جو اپنے ظلم کی وجہ سے ڈرے رہتے ہیں کہ کہیں ان پر کوئی حملہ نہ کردے۔ اس لئے جب وہ چلتے ہیں تو فوجی انکی حفاظت کرتے ہیں اور انہیں امن نصیب نہیں ہوتا۔(لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسھم) یہ معاشرتی اصول ہے جس کی رو سے لوگ عمل کرنے پر توجہ اور اپنی ذات پر اعتماد کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی سنت (طریقہ کار) بدلتی نہیں ہے۔ لہذا وہ کوتاہی کرنے والوں کو آگے نہیں بڑھاتا اور نہ محنت کرنے والوں کو پیچھے لے جاتا ہے۔ پڑھئے الانفال ۵۳ تک اور الاعراف ۵۷۔۵۸ تک

سورۃ ابراھیم

(۲۲) (الشیطان). البقرۃ ۱۴ میں دوبارہ دیکھیں اور جان لیں کہ یہ شیطان ہی کی طرف سے اعلان ہے کہ اس کی اطاعت شرک ہے اور وہ حساب کے وقت اس شرک سے بری الذمہ ہوگا۔ دیکھئے الفاتحۃ

(۲۷) یہ دکھایا ہے کہ وہ (اللہ) صرف ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے لیکن اس کی مشیت اس کی حکمت اور نظام کے برعکس نہیں ہے۔ پڑھئے الانعام ، الشوریٰ کا ابتدائی حصہ اور الانسان کا آخری حصہ۔

سورۃ الحجر

(۲۶۔۵۰) مثال کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ (الانسان) وہ نوع ہے جو ٹھنڈے مزاج والی ہے اور جو مٹی کے خواص رکھتی ہے کہ جس سانچے میں چاہے ڈھل جائے۔ اور (الجان) وہ آوارہ جنس ہے جو آگ کی طرح کا مزاج رکھتی ہے جس کے قریب جائیں تو وہ آپ کو تکلیف پہنچائے اور گمراہ کرے۔ آپ اسے پکڑ نہیں سکتے نہ اسے سیدھا کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں اقسام ہر امت میں ہوتی ہیں اس لئے سورت کے شروع کے سیاق میں تدبر کریں اور البقرۃ میں مذکورہ حصہ دیکھیں (یا ابلیس مالک) اور الاعراف ۱۲ میں پڑھئے (مامنعک) پھر یوسف میں انکی یہ بات (یا ابانا ، مالک) آیت ۱۱ میں اور البقرۃ ۲۴۶ میں یہ قول (مالنا ألا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وأبنائنا) پھر الصافات ۱۵۳۔۱۵۴ میں یہ قول (مالکم) اور القلم ۳۵۔۳۶ اور التوبۃ ۳۸۔۴۱

سورۃ النحل

(۲۰۔۲۱) کیا ہماری امت کے جاہل اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں جو ولیوں اور قبروں اور مزاروں میں موجود مردوں کو پکارتے ہیں اور ان سے اپنی حاجتیں پوری کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ پڑھئے فاطر ، الزمر اور الاعراف کا آخری حصہ پھر الاخلاص کی طرف واپس لوٹیں۔

(۷۶) (یأمر بالعدل وھو علی صراط مستقیم) یعنی جو کہتا ہے اس کے مطابق عمل کرتا ہے تاکہ دوسروں کے لئے اچھی مثال

بن سکے۔ برعکس اس کے جو لوگوں کے لئے قانون بنائے مگر کہے کہ میں قانون سے بالاتر ہوں، میں اس کے تابع نہیں اور نہ اس کا اطلاق مجھ پر ہوتا ہے۔

سورۃ الاسراء

(أسری) الاسراء نبیوں کی ہجرت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دیکھئے طه ۷۷، الاعراف ۱۳۸، الشعراء ۵۲، الدخان ۲۳، هود ۸۱، الحجر ۶۵ اور پھر النحل کے آخر میں تدبر کریں اور الاسراء سے اس کا تعلق دیکھیں۔

(المسجد الحرام) جس کی حرمت ہے اور جس کا سب احترام کرتے ہیں۔ دیکھئے البقرة ۲۱۷۔۲۱۸، اور الحج ۲۵۔

(المسجد الاقصا) دور کی۔ مدینہ کی مسجد جس کے اردگرد برکت کی گئی۔ وہاں نبی کریم ﷺ کو کامیابی اور قوت ملی اور الاسراء کے ذریعے فتح اور نصرت ملی۔ یہ سب اللہ کی آیات میں سے ہیں۔ دیکھئے یٰس ۲۰، التوبة ۱۰۶ پھر الاسراء کی طرف واپس لوٹیں اور ۶۰ اور ۹۳ تک پڑھیں۔

(۲۔۸) دیکھئے البقرة ۲۴۳۔۲۵۲، اور حضرت موسیٰ کا قصہ سورت کے آخر میں اور حضرت نوح کا ان کی نام کی سورت میں۔ اس سے آپ رسولوں اور ہجرت کے درمیان تعلق کو سمجھ سکیں گے اور یہ یاد دلائے گا کہ اصلاح کی راہ میں انہیں کن حالات کا سامنا کرنا پڑا اور انکی امتوں کے ساتھ کیا ہوا جنہوں نے انہیں پریشان کیا اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا۔

(۲۹) بتایا گیا ہے کہ بخیل اور اسراف کرنے والا، دونوں (ملوما محسورا) ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ محسور وہ ہے جس کا لوگ بائیکاٹ کر دیں اور وہ تکلیف اور پشیمانی میں مبتلا ہو جائے۔

(۴۵) (مسحورا) پاگل اور جس کی عقل پر بُرا اثر ہو۔ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ (حضورؐ) جو کہتے یا کرتے ہیں، اس کی سمجھ نہیں رکھتے۔ مقصد یہ ہے کہ جو قرآن آپؐ پر نازل ہوا ہے اسے باطل قرار دے دیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس واضح دلیل کے باوجود مسلمان اپنی کتابوں میں یہودیوں کی روایت کردہ حدیث کو بنیاد بنا کر یہ بات نقل کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ پر جادو ہوا۔ جس طرح کہ نصاریٰ اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں کہ المسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا وہ بھی یہودیوں کی روایات کی بنیاد پر۔

(۵۵۔۹۶) بتایا گیا ہے کہ عالم ارواح تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ علم درکار ہے۔ القرآن کو بھی روح کہا گیا ہے کیونکہ اس میں لوگوں کے لئے زندگی ہے۔ النحل کے شروع میں تدبر کریں کہ آیت میں قرآن کے ذکر کے درمیان میں یہ الفاظ آئے ہیں (او ترقی فی السماء) اسی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ معراج کا ذکر ہے۔ جبکہ یہ تو جھگڑالو مخالفین کا مطالبہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ماننے سے انکار کر دیا اور انہیں سمجھایا کہ رسول کو اڑنے والا یا حیران کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ سورت کے شروع سے پڑھیں پھر الکھف پڑھیں اور الفرقان اور القصص۔

(۱۰۱) (مسحورا) ہر زمانے میں مخالفین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اصلاح پسندوں پر کبھی تو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ساحر ہے جو لوگوں پر اثر انداز ہو کر باطل کو حق ظاہر کرتا ہے۔ کبھی یہ کہ اس پر جادو کیا گیا ہے، یا پاگل ہے، یا الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے اور بے عقلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اس طرح ان پر جو الزام لگاتے ہیں ان میں تضاد ہوتا ہے۔ وہ اسی دھن میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح اس کی گرفت کی جائے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ اس سے ہٹانا چاہتے ہیں تا کہ اس کی دعوت کے اثرات ظاہر نہ ہوسکیں جس سے ان کی زبردستی کی حکمرانی متزلزل نہ ہو جائے اور ان میں اور دوسروں میں فرق نہ مٹ جائے۔ دیکھئے ۴۷، الزاریات کے آخر سے اور النحل اور الانبیاء کے شروع سے۔

سورۃ الکھف

(۹۔۳۱) اس قصے سے یہ مثال پیش کی جارہی ہے کہ ان نوجوانوں کے دلوں میں ایمان کی قوت تھی اور دین کے لئے اذیت برداشت کرنے کی ہمت جو کہ اس زمانے کے آمر دیتے تھے۔ دیکھئے البقرۃ ۱۹۱۔

(فضربنا علی آذانھم) یعنی وہ لوگوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں سن سکے کیونکہ ان سے رابطہ منقطع تھا۔ (الشمس) بتایا گیا ہے کہ غار زندگی گزارنے کے قابل تھا کیونکہ اس میں دھوپ آتی تھی۔

(۸۲۔۹۹) اس قصہ میں ملک کی عظمت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے اور اللہ کا فضل جوان اسباب کو مسخر کرنے میں مدد دیتا ہے جو اس طرف لے جاتے ہیں۔ (مغرب الشمس) مغرب کی طرف ملک کی انتہائی حد۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی تک محدود تھا جیسا کہ کہا گیا ہے۔ (وجدھا تغرب فی عین حمئۃ)

(مطلع الشمس) مشرق کی طرف اس کی انتہائی حد۔ (سترا) احتمال ہے کہ اس سے مراد رات ہے جو لوگوں کو سورج سے چھپا لیتی ہے۔ یعنی وہ ایسی سمتوں میں تھے جن میں سال کے زیادہ دن سورج رہتا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رات کو لباس بنایا ہے۔ دیکھئے الفرقان ۴۷، النبأ ۱۰۔۱۱۔ یا یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد کپڑا ہے یعنی وہ وحشی اور برہنہ رہنے والے تھے۔ دونوں معانی کو ملایا بھی جا سکتا ہے۔ لہذا تدبر کریں۔ (یاجوج وماجوج) یہ وحشی غیر مہذب قوموں کا نام ہے جو ڈاکہ مار کر اور لوگوں پر حملہ کر کے گزر بسر کرتی ہیں۔ (قطرا) پگھلا ہوا تانبا جس سے دیوار مضبوط ہوتی ہے اور ایک ہی ٹکڑا بن جاتی ہے۔ اس زمانے میں یہ صنعتوں کی قوت کی دلیل ہے۔ اور ہر زمانے میں یہ ماڈرن ہونے اور ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہی وہ قومیں ہیں جو وحشی اور غیر مہذب لوگوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ لہذا اس حیرت انگیز قصے کو بیان کرنے کا مقصد سمجھیں۔ (یومئذ یموج فی بعض) یعنی جس دن دیوار ٹوٹ گئی جس سے ایک زلزلہ آ گیا اور قومیں آپس میں مل گئیں۔ پڑھئے الانبیاء ۹۶۔۹۷۔ غرض یہ کہ لوگ اگر اللہ کی سنتوں (طریقہ کار) پر نہیں چلتے اور ترقی کرنے کے ذرائع اختیار نہیں کرتے تو ان پر وحشی اور غیر مہذب لوگ حملہ آور ہو جاتے ہیں اور پھر وہ پستی کی طرف چلے جاتے ہیں اور افراتفری اور بدانتظامی کی وجہ سے ذلیل ہوتے ہیں۔

(سورۃ الکھف ختم ہوئی۔ جاری ہے)

☆.....☆.....☆

Surah *Al-Dahr* (الدَّهر) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 27

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is April 13, 1984 and today's lecture starts with verse 10 of Surah *Al-Dahr* (الدَّهر) (76:10).

The heavenly society – protected from evil sparks

If you remember, in the verses that we covered in the last lecture, Allah said: Be ever watchful that a situation does not arise where evil sparks start flying. Otherwise, no one in that society would remain untouched by it. It is a separate topic where I will explain how great importance the Quran attaches to the economic system of a society. And, its important can be judged by this fact alone when the Quran says: the only way to remain protected from evil sparks in society is to establish a system where no one sleeps hungry; where no one's needs remain unmet. We saw in the previous lecture how the مومنین established a system that made sure that no one really remains hungry – by giving freely of their surplus wealth to establish the system of universal welfare and nourishment, and, at the same time, not wanting any recompense or even a "thank you" for it: إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (76:9) – [saying, in their hearts,] "We feed you for the sake of God alone: we desire no recompense from you, nor thanks. We do this because: إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (76:10) – behold, we stand in awe of our Sustainer's judgment on a distressful, fateful Day! If we didn't do it then a period will come where a system of life will arise that will cause gloom and doom to everyone.

Please note how beautifully the Quran explains: فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا (76:11) – And so, (because of the universal system of sustenance they put in place) Allah will preserve them from the woes of that Day, and will bestow on them brightness and joy. When this system was established, it produced a society where there was true peace and tranquility; and true joy and happiness everywhere. Everyone was full of warmth and enthusiasm. There was no trace of gloom and doom anywhere. The Quran uses the following words for this: نَضْرَةً وَسُرُورًا – this society was full of synergy and heavenly bliss.

My dear friends, I want to repeat it again and again: please keep in mind that the society of which the Quran is talking about above actually existed in this world, where heavenly conditions did prevail as described above in verse (76:11). Please also note that the Quran is talking about the heavenly society in this world. The heaven of the Hereafter will of course come, but it would come later. The question is: what was actually done to establish this heavenly society that led to this outcome, here, in this world. The answer from the Quran: وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا (76:12) – This

outcome was a result of the perseverance and steadfastness they endured in establishing such a society (based on the universal welfare and nourishment) that eventually led to a beautiful life of bliss and tranquility in this world. This was heaven; this was freedom; this was garden of bliss; this was an environment full of vitality and warmth.

Heaven in the Hereafter after the heaven *here*

Dear friends, now that we are reaching the last verses of part (جز) 29 of the Quran there will often be descriptions of heaven and hell, which will especially become much more detailed in part (جز) 30. We believe in the hell and the heaven of the Hereafter which the Quran describes often, and in great detail; but, let me mention again that a heaven is also established on the basis of universal values given in the Quran – here, in this world. Let me also emphasize again that these descriptions of heaven and hell are described in the Quran as similes and as examples. We should not use the dictionary meaning of the words related to heaven and hell because the Quran explains them only as allegories. For example, it says: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (13:35) – the heaven that has been promised to virtuous ones (مُتَّقُوْن) its example is this: مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (13:35) — THE PARABLE of the paradise promised to those who are conscious of Allah is that of a garden through which running waters flow but, unlike any other garden, its fruits will be everlasting, and so will be its shade. This description of paradise is given only as an example.

Explanation of محکمات (*Muhkamaat*) and متشابہات (*Mutashaabihaat*) verses of the Quran

Dear friends! You know that the Quran has classified its verses into two categories of محکمات and متشابہات. محکمات are those verses that are related to laws and commandments with definite meaning. One must take the dictionary or literal meaning of words in these verses. For example, when the Quran says that such and such things are forbidden for you, then one has to take the literal meanings of the words and not their metaphorical meanings. But in متشابہات verses the matter is explained in metaphors and similes. These are matters related to metaphysical or supernatural aspects. These are beyond human intellect to understand. For example, it is beyond human intellect to understand the world of Allah's امر, His Personality, and the workings of his angels (ملائکہ) etc. These things are beyond human intellect to comprehend. The same is true of matters related to life after death, and the heaven and hell. We cannot understand these at the present level of our consciousness. That is why the Quran describes these by examples and similes. So, since the description of heaven is coming now, please understand that these are being explained in similes and metaphors.

Condition of the Arab society at the time of the Prophet (PBUH)

My dear friends, what are the things described by the Quran as examples of heaven?

For this we have to look at the Arab society of that time. You know that the Arabs could only see deserts everywhere. There were some oases scattered here and there which they used to call paradise. They used to put their tents and set up their homes around it when they found an oasis. When the oasis was gone they would gather their tents and their meagre belongings and would start their nomadic journey in search of another oasis. They were nomadic Bedouin people always on the move. That was their life. But, on their both sides existed two great empires with impressive civilizations: on the west the Byzantine (Roman) Empire, and on the east the Persian Empire. They were amazed by these impressive empires. These were not just thousands of years old empires but they possessed all the things of beauty, comforts, and luxury. This left the Arabs in wonder and awe! These poor Arabs had only dates to eat. They even used to ground the date stones and eat its flour. That is the reason the Persian poet Firdausi makes fun of them. He says that these poor Arabs drink camel's milk and eat desert horn lizards! This was the situation of these Arabs surrounded on both sides by two of the greatest empires. The Iranian Empire even shared borders with Arabs; and Iranians used to travel to these Arab lands. Let me mention here that what we call Iraq, its eastern region was called Persian Iraq then, and it used be part of Iran. Its capital was Al-Mada'in (also referred to as Seleucia-Ctesiphon). Now you can very well imagine what these poor Arabs, who used to eat desert horn lizard and drink camel's milk, would have been feeling when seeing all those things of comfort, beauty, and luxury of Iranians? The description the Quran has given as an example of paradise, is almost all of it existed in the Persian Empire and its culture. These Arabs were being told by the Quran that if you adopt the laws of Allah in your society then you would also enjoy the same things of comfort, beauty, and luxury that you see with awe in those Iranian and Roman Empires.

Brown's history of Iran

My dear friends, what all the Iranians possessed can only be appreciated by studying the detailed history of Iran. If one studies Brown's history of Iran then one can get the picture of the Iranian society of the time. The example of paradise that is given by the Quran, it seems as if the luxury and comfort of the Iranian culture of the time are being described literally. What I am saying here please do not mistake it. I am only saying that what the Quran describes as things of comfort and luxury were present in the Iranian culture; but I am not advocating its evils that were there no doubt. That is to say the Quran presents its system, that if it were established, it will produce all the good things of life that were present at the time in Iran, and the Arabs were aware of them. And please also note that, as mentioned before, these descriptions of heaven should be taken as examples only.

Arab Victory over Iran and the sorry state of its empire

Dear friends, I want to mention briefly the state of the Iranian Empire during Caliph Omar's time. I have written about it in detail in my book *Shahkar-e-Risaalat* (The

Pinnacle of Messenger-hood). Those were strange events. They are worth reading from history: Iran was conquered by Arabs. Its king Yazd Gard was on the run and could not get shelter anywhere. In the end, he was hiding inside a waterwheel when he was killed. The *king* of Iran and *this* was his end! This was in 16th A.H. or 637 A.C.

Sa`d ibn Abī Waqqās and the details of Iran war bounty

My dear friends, during the Islamic Caliphate, one fifth of the war booty used to be sent to the capital. So, these treasure from Iran arrived in Medina with a letter from the commander of the victorious Muslim army Sa`d ibn Abī Waqqās. I want to describe some of the things that arrived in Medina among other precious and luxury items: There was Kisra's (Chosroe's or Khosrau's) crown and necklace and clothes full of precious pearls and stones; his sword and body armor were also full of precious stones and jewels. The eyes of the people of Medina could not believe this pile of treasure! This was the first time they had seen all these things. There was a 60 square yard carpet made of gold engraved with the map of Iran scattered with rivers of pearls with gardens on both sides. The trees were made of golden trunks, their leaves of pure silk, and their fruits of precious pearls and stones. Sa`d ibn Abī Waqqās had written that all these precious treasures were under the control of Muslim soldiers with no one around, but they did not take even a single thing for themselves. They brought everything to their leader.

My dear friends, what I am saying is simply this: Sa`d ibn Abī Waqqās had described all this war treasures in his letter to Caliph Omar. With this one example one can very well imagine what wouldn't be there in the Iranian culture and civilization? If we see only these things then a picture emerges of the paradise that the Quran has described as example. First, the Quran says: وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (76:12) – and Allah will reward them for all their patience in adversity with a garden of bliss and with garments of pure silk. حَرِیر is thick silk. What to say of this Arabic language my friends! How words take us from one aspect to the next, from one level to another! A garment made of silk is used to keep one warm. And because it is warm, it is called حَرِیر. حر (with its plural احرار) is derived from the same word and it means free. And the one who is free cannot be a slave. Also, warmth is related to life and freedom in contrast to cold which is related to slavery and death. The words "احرار" "حرارت" "حر" "حریر" are all derived from the same root ح - ر - ر . Please note that from this point of view, the word "حَرِیرًا" –which has come for the people of paradise in verse 76:12 – encompasses the meaning of warmth, freedom, and luxury. On the other hand, in hell, there is subjugation, slavery, fetters and chains: سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا (76:4). In contrast to this the very first word in heaven "حَرِیرًا" tells about warmth, garments of silk, and freedom. You can see how in every word of the Quran, is hidden meanings of both the worlds – here as well the Hereafter. This is the case in a heavenly society: مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (76:13) – In that garden they will on couches recline, and will know therein neither burning sun nor severe

cold.

Caliph Omar and comparative survey of Arab and Iranian cultures

My dear friends! An envoy of the Roman Empire came to Medina to see in what style the "king" of the Arabs lived. He was looking for him and could not find him. Someone offered to take him to Caliph Omar. But when they reached they saw him taking nap in the sun using his cloak as a pillow on a sandy gravel ground. The person told the Roman envoy that he was our leader Omar. The envoy was totally aghast at this scene! This was how the leader of the Muslims was living?! In contrast, the general public was enjoying a lifestyle which the Quran describes as: مُّتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ (76:13) – They will be sitting on couches that recline. Please notice the contrast: this is Arabia where both summer and winter are harsh; and they will be sitting on couches of power and authority! And the environment will be such that: لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (76:13) – there will be neither burning heat nor severe cold. The environment will be moderate like spring, considered to be the best weather. In Arabian deserts and heat only date trees survive; and we know they don't produce any shades – in fact, they hardly have any leaves and even that at the tall end of a long dry branchless trunk. But in heaven this situation will not be like this. There will be garden with lush trees: وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (76:14) – and its blissful shades will come down low over them, and low will hang down its clusters of fruit, most easy to reach. But my dear friends! The fruit-laden trees with blissful shades happen in other human societies too. But the Quran says here that in the society based on its permanent universal principles these fruits will hang down so low that one does not have to make an effort to stretch one's hands to get to them. This is a truly a heavenly society!

One should cure *my* pain

My dear friends, the yield of grains and fruits has increased many folds in our time. But the more it has increased the further it has become out of reach of the general public. Whether it is the mangoes in summer or the oranges in winter, the common man can only see them from a distance. You can imagine how far these have gone away from the reach of the ordinary people. The Quran is sketching a scene to show as an example of what will happen in a heavenly society: gardens with such trees that will be providing blissful shadow and at the same time will be laden with fruits whose clusters will be hanging so low that they will reach the hands of everyone. This is heavenly society, my dear friends! Yields may increase thousand times. But, if these are beyond the reach of the poor then, what is the benefit to them?

Let one claim to be the son of Mary;

One should cure my pain, my misery!

My dear friends, only those fruits will cure the pain and misery of the poor which are within their reach. And, yes, they will be living in a heavenly society where there will

be fruits: وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا (76:14) – hanging down its clusters, most easy within their reach.

My dear friends, the Arabs did have pots and pans but they were not beautiful to look at. Now, the cultural aspect came into the picture which we call ثقافت (*Saqaafat*). Arabs had a tribe named بنی ثقیف (*Bani Saqeef*). This tribe used to make and sharpen swords. The culture of Arabs revolved around the sword; but our culture revolves around song and dance. Please examine Islamic culture in this context. Anyway, the next characteristic of that system is:

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ؛ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا (76:15-16) – And they will be waited upon with vessels of silver and goblets that will seem to be crystal-like, but of silver – perfectly made, the measure whereof they alone will determine. These are the things that Arabs didn't have; but the Quran says that in the new system they will have access to these beautiful objects. Then it says: وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا (76:17) – And in that paradise they will be given to drink of a cup flavored with ginger.

To keep human energy in balance

My dear friends! In verse (76:5) it was said: كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا and here in verse (76:17) it is said: كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا . Both كافور and زَنجبیل are used as medicine. I had mentioned in the previous lecture that the purpose of these is to keep energy level in balance. The Quran wants to keep human energy into balance. Too much energy or too much weakness are both bad to society, and lead to evil. They must be brought into balance by dinks made up of كافور or زَنجبیل. Please look at the fine points in these words.

Every drink is called شراب (*Sharaab*) in Arabic

My dear friends, as I had mentioned in the last lecture شراب in Arabic is not the same thing as شراب in our language. In Arabic, every kind of drink is called شراب. Sorry, Soft drink! Because in English "drink" is now used for wine. Anyway, the Quran says they will have drinks that will restore their balance. Well, it is not possible to talk of something important without the metaphor of drink and cup! So, on the surface, it may seem that this talk is about drink and cup, but, in reality, it is about Islamic system in which the power is kept in balance: وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا (76:17) – And in that paradise they will be given to drink of a cup flavored with ginger.

The meaning of مِزَاجُهَا

My dear friends, مِزَاجُهَا does not mean that this kind of effect is in the drink itself: If this drink is of زَنجبیل then it will increase warmth and if it is of کافور then it will reduce it. But, here it is said: مِزَاجُهَا which means that it is added to the drink to produce the desirable effect. My dear friends, if I come to the detailed explanation and meaning of words then it will take hours and I do not have that much time in these lectures. For example, if I were to come to this word "زَنجبیل" and its history, then it would take one

lecture by itself. Anyway the Quran says: مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا (76:17). But, where does this drink come from? The Quran tells: عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا (76:18). This is a fountain having life-giving drink derived from a source to be found therein, whose name is "Seek Thy Way". The Quran says about this fountain: يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (76:6) – they bring out this fountain from the depths of their hearts by piercing hidden rocks within.

My dear friends, it is as if Iran's picture is being drawn here. But the words used to describe provide the entire teachings of Islam. The Quran says that these fountains are not coming from somewhere else, from somewhere far off. Rather, these fountains spring out from deep inside of hearts of those that establish and maintain this heavenly society. They are an integral part of a true Islamic society because they are essential for life's necessities. If you remember the Quran said in Surah الْمَاعُونَ that streams that carry the sustenance and nourishments of life in the society should be left to flow freely to the door of every needy person without any obstruction. But the rich and the powerful of the society stop these free-flowing streams, by putting their own barriers; thus depriving the needy of their life-giving sustenance. And, as a consequence, evil sparks start flying around. When hunger and poverty become rampant then the entire society turns into a tinderbox.

Putting barriers on free-flowing steams of sustenance

My dear friends, this is the reason the Quran said about those who think that performing the religious rituals is enough. If that is the case then they are deceiving themselves: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ; الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (107:4-5) – Woe, then, unto those praying ones whose hearts from their prayer are remote. الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ (107:6) – those who want only to be seen and praised by others that they are very pious. But they put barriers on free-flowing sustenance: وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (107:7) – and, withal, deny all assistance to their fellow-men! The streams of sustenance that need to flow to everyone in society; they put barriers on them thus preventing others from their sustenance. These are the مُصَلِّينَ for whom there is destruction because they put barriers on the free-flowing sustenance: وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (107:7). In contrast, in the Quranic society – i.e., the heavenly society established on the universal permanent values of the Quran – the stream سَلْسَبِيلًا (76:18) keeps asking: "Where do you want me to come? Let me know. I will come to you and fulfil your needs."

The meaning of the Quranic terms were changed

My dear friends! These are the words of the Quran. These are the terms of the Quran. One of its terms is also سلسبیلا (*Sal-Sabeel*). I have not seen it in Lahore but I saw a petrol pump in Karachi named سلسبیل. Such have become the use of Quranic terms with us! When the term مُصلّین (*Musalleen*) has become نمازی (*Namaazi*) then why not سلسبیل become a petrol station?! (No wonder many Muslims name their commercial enterprises using the words Allah, Mecca, Medina, etc.) This way we are misusing the words and terms of the Quran. The Quranic مُصلّین and the Quranic

سَلْسَبِيلًا are no longer to be found anywhere in Muslim societies. Please note down another reference (83:26-27): خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ; وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ – pouring forth with a fragrance of musk. To that drink of paradise, then, let all such aspire as are willing to aspire to things of high account: for it is composed of all that is most exalting.

The Quranic words "مسک" (*Musk*) and "تسنیم" (*Tasneem*) and their meaning

My dear friends, the Quran has unique and miraculous meaning in each of its words. It says خِتَامُهٗ مِسْكٌ (*Khitaamuhu Miskun*) – the seal is made of "مسک" which we call (in Urdu) مشک. This is same thing as was mentioned before in relation to زَنجَبِيل. What is its purpose? It says: وَمِزَاجُهٗ مِن تَسْنِيم. But please forgive me! We use it for different purpose. For example, when the first girl is born we name her نسیم (*Naseem*); then after that we name the second girl شمیم (*Shameem*); and then, the third one we name her تسنیم (*Tasneem*)!

My dear friends! تسنیم is the waterfall whose height is very high. For rain and for revelation the word is نزول (*Nuzool*) which means to come down from above. This fall whose name is تسنیم falls down from a great height; and asks for the way leading to everyone's door who is thirsty; and by quenching his thirst, it moves on to the door of the next thirsty person; and on and on…it keeps going.

مومن (*Momin*) always flies higher and higher

My dear friends, it is told about this heavenly fall (named *Tasnim*) that: وَمِزَاجُهٗ مِن تَسْنِيم – it is composed of that which is most exalting. And it has the seal of musk. In it has been added a little زَنجَبِيل (*Zanjabil*) to create warmth and energy for those who drink from it. The question is: Why is this all being done? The Quran says it is done: ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ – so that in the race of life, on the highway of world-nations, those who want to get ahead could get ahead. These drinks and the comfort are given for getting ahead in life. These are meant for rejuvenating the life of nations; and a مومن nation is always higher and on top of other nations. A مومن cannot accept any other to be equal and higher than him. A مومن can never accept orders from anyone above him except Allah. A مومن always keeps moving higher and higher: وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) – let all such aspire as are willing to aspire to things of high account, get ahead.

Social conditions in heavenly society

My dear friends, the Quran says: وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا (76:19) – And immortal youths will wait upon them: when you see them, you would deem them to be scattered pearls. That is, there would be family members in heaven but only those that deserve to be there. Being a son of a famous father doesn't entitle one to go to heaven. Blood relationship is of no value there. Only those people will go to heaven who earned it. The Quran has presented a picture of heaven where one would like one's family members to be there as well. Therefore, one should think

about one's family members' welfare as well. "When that happens then your youth will be there possessing vitality, good features, and good attributes and habits. When you will see them there, you will feel as if you are seeing shining pearls." This example of shining pearls reflects their shining spotless character. If you remember, there is a pamphlet entitled "گوہر تابندہ" or shining pearl. (In Arabic a pearl is called لُؤلُؤ). This metaphor is used for describing a person with shining spotless character. So, this type of youth and children will be there. And then the Quran used the word "منشور". What to say my friends!? This word is used for scattered pearls. This signifies that the children in that society will not be confined to the walls of homes because of fear of safety or fear of acquiring bad habits. The entire society will be a heavenly society. There is no corner in heaven that will be hell just as there is no corner of hell that is heaven. So, these are the scattered shining pearls of the heavenly society: لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا (76:19) – that the Quran is talking about, and where there will be no trace of hell.

Power as well as beauty along with comfort – in a heavenly society

My dear friends, after this the Quran says: وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا (76:20). What would be available there? Well! If one looks at the Universe then one sees both its beauty as well as its power. The same will be reflected in the heavenly society: on one side will be things of comfort, beauty, elegance, and elements of grace. And, on the other side, will be power, authority, and true national sovereignty of a free country. These are elements of power. The Allah of the Quran is: الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (85:8) – Powerful as well as worthy of being appreciated and full of grace. It is said in this verse (76:20) that when you observe this heavenly society carefully then you will find its two important characteristics: 1) things of comfort, beauty and grace; and 2) power and authority as well. This power and authority is: مُلْكًا كَبِيرًا (76:20) – a great nation-state!

A state spread over 2.3 million square miles

My dear friends, this is the aspect of power and authority of Islam that kept on expanding. The people of Mecca and Medina kept on expanding this Islamic power and authority because its human condition of beauty and grace attracted other peoples to it. You can very well imagine that in just few years, by the end of the Prophet's (PBUH) life, the Islamic state had reached one million square miles; and during the period of Caliph Omar (634-645) this had reached 2.3 million square miles including all of Iran, the Roman Byzantine, Egypt, and even areas of Baluchistan in Pakistan. Little later, as history tells, the Islamic state had reached the doors of China. This Islamic state was so great that its left-over has created more or less 60 Muslim countries in the world. They owe their existence to the efforts of the Prophet (PBUH) and his companions. These are the thrown-away broken pieces of that once great Islamic state that we continue to chew until today. It is altogether a different matter though as to what that once great Islamic state stood for and what our so-called Muslim "independent" states now stand for? But, still the remnants of that

once great true Islamic state – مُلکًا کبیرًا – still retain some of it's power, comfort, and beauty – though in the form of broken and gnawed pieces!

Reach and access over the bounties of ملک کبیر (*Mulk Kabeer – The Great Nation*)

My dear friends, please note that these verses are not talking of fakirs, dervishes, religious mystics and priests but of ملک کبیر. The Quran says that ملک کبیر is the result of belief (ایمان) and good deeds (عمل صالح). Let us come to the aspect of luxury and comfort in this state. The Quran says: عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ (76:21) – they will be dressed in garments of pure silk and brocade, made of thin as well as thick silk. And further: وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ (76:21) – they will be adorned with bracelets of silver. The word "اَساور" (*Osaawir*) is a strange word. Its literal meaning is height, elite status, dignity and respect. From the same root (س - و - ر) is derived the name of the chapters of the Quran called Surah (سورہ) i.e., taking one towards high level. The high elite and close advisors of the king in Iran were called اَساور. (The same way as the closest advisors of the Mogul king Akbar were called "the nine gems".) These were the very few chosen ones among the elites in the Persian Empire. The اَساور in Iran were given gold and silver bracelets to wear as a sign of their high and powerful status. This will be the sign of the people of heaven. Just as I mentioned before, these are the words through which the same picture is being presented by the Quran as there was in Iran. The Quran emphasizes further that: وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (76:21) – And their Sustainer will give them a drink most pure.

All this would be the result of man's own good deeds

My dear friends, it may come to mind by this mention of drink that evil things will pop up in their character due to their high status, and due to their life of comfort and luxury; because what we call شراب, we know what it does to its drinkers? That is why the Quran immediately dispelled this thought right away: وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (76:21) – And their Sustainer will give them a drink most pure that will produce and maintain purity in their high character and balanced lifestyle. Also, this will be given to them not as free gift. In fact, it is we who have created loopholes for our own self-interest that heaven will be distributed as baksheesh. Please remember! Heaven is never gotten as baksheesh but is *earned*; and it is given as a return for good deeds: اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (76:22) – And they will be told: "Verily, all this is your reward since your endeavor in life has met Allah's goodly acceptance!" Allah is rewarding for their hard work with the fruits of their labor. "Your effort has produced its full output. This is not a piece of charity that is given to you." The Quranic society is founded on the principle: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) – nothing shall be accounted unto man but what he is striving for. And that the return is *only* for the effort, and *not* on the capital. Now, how to establish this society? The Quran says that Allah has given the blueprint for its establishment in his Book: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا (76:23).

The Quran's advice to establish such a society: Do it step-by-step

My dear friends, here in verse (76:23) Allah says: "We have sent down this Quran step-by-step so that you can establish its heavenly society also step-by-step. This Quran has been sent down from Us gradually and slowly for your benefit." This is because an evil system that was prevalent at the time of the Prophet (PBUH) could not be changed overnight. This Quranic system could not be established by revolution but by evolution, in a gradual step-by-step manner. This requires, first of all, a change in attitude; a change in self; a change in psychology; and a change of heart by a fundamental change in people's character and their personality. The fountains of this change are to spring out from the very depths of their hearts. One can produce a hectic revolution in a short time on the basis of power but this cannot produce a change in the hearts of people. But the real revolution that accompanies change of hearts requires proper teaching and education, proper training, and purification of character: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (2: 129).

Caliph Omar's own account of his acceptance of Islam

My dear friends, to bring about this revolution there was none other than the Prophet (PBUH) as a teacher himself, and the companions as his students. The Quran tells that the duty of the Prophet (PBUH) was: to teach the knowledge and the wisdom contained in the Book of Allah using Allah-given intellect; to create Allah-consciousness in their hearts; and to purifying the hearts and minds of his companions. These were the people through whose hands the heavenly Quranic society was to be established. This was a slow, painstaking, and long difficult process that could not happen overnight.

Also, as such, all the companions are equally worthy of the high place they occupy; and all of them are worthy of praise and appreciation. But the companions through whose hands the Islamic state came into existence, the name of Omar (R) occupies a special place among them. The question comes again and again as to how he became Omar Farooq from Omar Ibn Khattab? He describes himself of his conversion to Islam thus: "I went out one night to the place where I and others used to drink and have good time. But no one was there that night. So I got quite disappointed. It was our usual practice to go home late at night. So, I thought let me go to the Ka'aba: maybe there was someone that I could talk to and pass some time before I go home. When I reached its perimeter I saw that someone was reciting something in a very striking voice. This recitation started affecting my heart rapidly. I very quietly stood at a side so that the person won't notice me. I found that it was Muhammad (PBUH) who was reciting the verses of the Quran. He kept reciting and the words of the Quran started penetrating and changing my heart. I thought: O Allah! This is the book against which there is so much hatred? In fact, this Book is quite the opposite. After this I hid myself inside the cover of the Ka'aba. I was careful not to disturb Muhammad. He kept reciting. It was a clear night full of stars; there was the quietness

of Ka'aba; there was this unique striking voice of Muhammad (PBUH); and there were these unique heart-piercing words of Allah – what an atmosphere it was?! I kept listening. When Muhammad (PBUH) finished reciting and started for his home I followed behind him quietly. When he reached home he turned his face and saw me. It was well known that I wanted to kill him. He asked why I was there at this time of the night. I said that I was just following him. He asked what my intention was. I told him that my intention was to kiss his hand; that whatever you were reciting I want to recite as well; that my intention is that I want to accept Islam." How many days and nights of agony would have taken for Omar Ibn Al-Khattab to reach this stage, one can't say. But his study of Islam and his purification of character started from that moment onwards under the tutelage and guidance of the Prophet (PBUH). And that is how Omar Ibn Al-Khattab became the great Omar Farooq!

My dear friends, the Quran was sent down gradually. It was not meant that one should stay in a closed room and should recite its words on the beads of a rosary (تسبیح). There is no struggle involved in doing this. There is no opposition from anyone in doing this. But this Quran was about establishing a system; and, opposition against it was natural– and it happened. This is the reason the Quran said: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (76:24) – many difficulties will come in its way; there would be extreme opposition in carrying out its obedience and commandments. So the Quran says: bear all this with great patience and perseverance. And the most important thing is that: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا (76:24). What great meanings are contained in the words آثِمًا and كَفُور! The traditional translation is: and pay no heed to any of them, who is a wilful sinner or an ingrate. But this translation does not do justice to the depth of meaning contained in the words آثِمًا (*Aathiman*) and كَفُور (*Kafoor*).

Tiresome program

My dear friends, this kind of system, this kind of governance, and this kind of program and its organization are extremely difficult; and make those who carry them out very tired. The meaning of the word اثْمٌ is something that makes one tired. And the meaning of كَفُور is that which grounds human abilities. In every human rule this is what happens. They kill human creativity and make life so difficult for people that they get tired both physically and mentally. Those who maintain this kind of a system try their best that people's natural potentials are never realized. Therefore, the Quran says: Do not obey them (76:24). Instead: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ; وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا (76:25-26) – bear in mind to imbibe your Sustainer's attributes morning and evening in your life and during some portion of the night; and bow down in obedience before Him; and carry out His limitless glory throughout the long night. My dear friends! Some people start deciding timings of prayer from these verses. But from my fifty years of study of the Quran, I can tell that timings of prayers cannot be determined from the Quran.

The reason for my opposition to Ahl-e-Quran

My dear friends! I do not get involved into sectarian debates. I always say that we should maintain whatever tradition regarding rituals has down to the Ummah; and to not change it or create any new ways. My fight with Ahl-e Quran is on this issue because they created a new sect on just this matter: that the number of prayers is three instead of five, using the above verses (76:25-26). Was the ship of Ummah drowning with five prayers that it needed to be saved by having three prayers? What was achieved by this change anyway? Instead, if they had focused on the real meaning and purpose of صلاہ then that would have been more helpful.

Prophet's Shu'aib's صلاہ

Anyway, the Quran told: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ (76:25) – Spread Allah's universal system of sustenance; keep on struggling morning and evening, and some parts of the night; and remain unswervingly steadfast in this struggle: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (76:24). Whether it was three prayers or five or ten –whatever the number –this is not an issue of deep concern. Prophet Shu'aib asked his people to let him establish his صلاہ. Thinking that it is just a matter of performing worship, they said: Go ahead and establish your worship your way, and we will do our worship our way. We are not going to oppose you. When he established his system of صلاہ then his people asked him: O Shu'aib! What is this?! We thought that you will do some kind of prayer and worship. But your system of صلاہ doesn't even allow us to spend our wealth the way we want. What kind of صلاہ is this?! He said: Yes! This is Allah's system of صلاہ. This is the reason the Quran said: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (76:24) – many difficulties will come in the path of carrying out the order of Allah, the provider of sustenance and nourishment; there would be extreme opposition to it. So be steadfast and unwavering in carrying out this order (صلاہ) of Allah with patience and perseverance.

My dear friends! We had full freedom to worship even during the British rule in India. Even today the Hindu secular government allows Muslims to pray نماز (*Namaaz*). What kind of steadfastness is required for this? What kind of system is there in this نماز to implement that will generate opposition and invite a flood of hostilities? What kind of obstruction it is going to cause in the current order of things that will not be permitted to Muslims to carry out? Nothing like that. On the other hand, the Salah (صلاہ) was to declare that no human (or collection of humans) has the right to rule and govern over other humans. *This* is the صلاہ my friends! And, no government can allow this:

If the Mullah has the permission of prostration;

The ignorant one thinks that Islam has freedom.

This is the difference between نماز and صلاہ my dear friends!

The real reason for opposition

The Quran said about those who oppose its system: إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا (76:27) – They love short-term gains because these are easily obtained. They pile wealth and give some small percentage to charity; they always look for profit whichever way it comes; and they are always in search of loopholes to save money – these are all short-term benefits that they keep in front of them. But the long-term goals? يَوْمًا ثَقِيلًا (76:27) – this is difficult and they put away behind them. This is a Day that will be hard. They are ever proud that they are very strong and powerful. But they forget: نَّحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا (76:28) – It is We Who created them, and it is We who made them strong; but, when We will, We can substitute the likes of them. They have forgotten that the haughtiness they display so much because of their wealth and power and because of the means and the wherewithal they have – these are all created by Us and if We take them away then nothing will remain with them.

If they do not change their system then they will be finished

My dear friends! The Quran openly declared: وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا (76:28) – It is not impossible for Our Law of Requital to bring another people in their place. The Quran has said this at many places. This was not said just to the unbeliever and idol worshipper Arabs but to us as well who claim to be believers. If we do not establish the system of the Quran – though we keep saying with our tongue that we believe in the Quran – then Allah says that He will bring another nation that will establish it. إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (76:29) – This is an admonition: Whosoever will, let him take a (straight) Path to his Sustainer. This is an open system not restricted in time or place. Any nation who is willing to establish this system can do so. After this the Quran says: وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ (76:30). This verse requires some explanation.

My dear friends, in the entire Quran you will find that it says again and again that Allah has given human beings freewill and freedom of choice; that Allah has given man total freedom to choose any of the two ways – the right way or the wrong way. This is why man becomes responsible and accountable for his choice. In another place the Quran says: وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) – Say, "The truth has come from your Lord": Let him who will, believe; and let him who will, reject it. This is the entire teaching of the Quran. Here also, in this verse (18:29), it says فَمَن شَاءَ as it says in verse (76:29). But the way the usual translation is done for the next verse (76:30), the entire edifice of the Quran falls down. Let us see this translation: وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ (76:30) – But you cannot not will, except as Allah wills. Thus all the other places where Quran says: "you are free to choose whatever you want" come crashing down to the ground from this translation. According to this translation Allah controls everything. Also, the standard sermon that is repeated all the time – Whomever He wants He will guide and whomever He wants He will

misguide – leaves no doubt in the minds of Muslims that Allah controls their lives. They say that one of the attributes of Allah is مُضِلّ which is generally translated as "one who misguides people"! This means that man cannot choose anything from his own freewill. According to the rules of grammar and according to many reliable interpreters the correct translation of verse: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ (76:30) is: – Since Allah has showed the two ways – the right way and the wrong way – we should choose what Allah wants us to choose, i.e., He wants us to choose the right way according to our own freewill although we are free to choose the wrong way. But whatever way we choose – the right way or the wrong way – *we* are responsible for that choice; and *we* will be held accountable for it. If Allah is choosing for us then where is our freedom? And why should we be held accountable for that choice that we never made? And why should one be sent to hell if Allah misguided him? This does not make any sense.

My dear friends, the Quran then says: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (76:30) – for Allah is full of Knowledge and Wisdom. It is Allah who knows what the right way is for us in the long-term. And, He wants us to choose the right way. Then we will be able to enter into His Grace: يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ (76:31) – But, here again, the words "مَن يَشاء" has come, and the usual translation is: He will admit to His Mercy whom He wants. But if it He who wants to admit then where is our freewill then? The real meaning actually is this: Whoever wants to be admitted, Allah admits him to His Mercy. But if one is engaged in misconduct then obviously it means that one does not want to be admitted to His mercy. Then Allah will render His verdict: وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (76:31) – this would be considered wrong and a transgression; and there will be grievous penalty for that. However, if we accept the traditional translation: "But you cannot will it unless God wills" then why is this wrong and a transgression and grievous penalty? Again, this does not make sense. In fact, those who are ظالمین they are so by their own free choice. You know that ظلم means darkness; that whatever proper place is for something it is not kept at that place; that whatever proper place is for someone he is not at that place but he has snatched away someone else's place and occupied it. That is why in this verse (76:31) the Quran says that remember! For transgressors and evildoers - Our Laws of Requital has readied grievous suffering.

My dear friends! Surah *Al-Dahr* (الدّھر) is finished today. We will take Surah *Al-Mursalaat* (مُرسَلات) in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
8

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com